BUDE-142

میر امن دہلوی کا خصوصی مطالعہ

Special Study of Meer Amman Dehlavi

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

3

میرِ امن دہلوی کا فن (حصہ دوم)

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 8
'باغ و بہار' کی تدریس منتخبہ متن کے حوالے سے 83

اکائی 9
میر امّن دہلوی کی نثر نگاری اور گنجِ خوبی 93

اکائی 10
10 باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ 103

اکائی 11
باغ و بہار میں ہندوستانی معاشرت 115

بلاک 3 تعارف

بلاک 3 ''میرامن کا فن (حصہ دوم)'' سے متعلق ہے اس بلاک میں کل 4/ اکائیاں ہیں جن کے بالترتیب موضوعات 'باغ و بہار' کی تدریس منتخبہ متن کے حوالے سے'، میرامّن دہلوی کی نثر نگاری اور گنجِ خوبی، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ، اور باغ و بہار میں ہندوستانی معاشرت' ہیں۔

تیسرے بلاک کی پہلی یعنی اس کورس کی آٹھویں اکائی ('باغ و بہار' کی تدریس منتخبہ متن کے حوالے سے) ہے اس اکائی میں 'باغ و بہار' کے منتخبہ متن کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

نویں اکائی (میرامّن دہلوی کی نثر نگاری اور گنجِ خوبی) ہے اس اکائی میں 'گنجِ خوبی' کا منتخبہ متن بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ تا کہ 'گنجِ خوبی' کی خوبیوں تک رسائی ممکن ہو سکے۔

دسویں اکائی (باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ) میں باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے فنی لوازمات، دونوں کی جزئیات، ادبی اہمیت اور مابین فرق و امتیازات کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے معاشرے کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

گیارہویں اکائی (باغ و بہار میں ہندوستانی معاشرت) میں سے متعلق ہے اس اکائی میں باغ و بہار کی خصوصیات اور اردو میں باغ و بہار کے مقام و مرتبے کے تعین کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی، ادبی و معاشرتی معنویت کو مدلل طور پر اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی نمبر 8 'باغ و بہار' کی تدریس منتخبہ متن کے حوالے سے

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 باغ وبہار کے جملہ پہلوؤں کا مطالعہ

8.3.1 باغ وبہار کا منتخبہ متن (اقتباس)

8.3.2 باغ وبہار کے منتخبہ متن کی تشریح

8.3.3 میرامّن کا طرزِ تحریر

8.4 آپ نے کیا سیکھا

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 سوالوں کے جوابات

8.7 فرہنگ

8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- میرامّن کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کریں گے۔
- 'باغ وبہار' کے قصے سے واقف ہوں گے۔
- باغ وبہار کے منتخبہ متن کا مطالعہ کریں گے۔
- میرامن کے اسلوب کا تجزیہ کرسکیں گے۔

8.2 تمہید

گذشتہ اکائی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ داستان اردو کی ایک اہم صنف ہے۔ اردو میں اس کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ دکن میں لکھی گئی سب رس اور شمالی ہند میں تحریر کی گئی متعدد داستانوں کے ناموں سے بھی آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ مثلاً قصّہ مہر افروز و دلبر (از عیسوی خاں)، نوطرزِ مرصّع (میر محمد حسین عطا خاں تحسین)، نو آئینِ ہندی (مہر چند کھتری)، عجائب القصص (شاہ عالم ثانی)۔ یہ وہ داستانیں ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل لکھی گئیں۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو اس ادارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کو دیسی زبان سکھانے کی غرض سے بہت سی کتابیں لکھوائی گئیں۔ زیادہ تر قصے کہانی کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج میں تدریس کے لیے جو داستانیں ترجمہ ہوئیں ان میں میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، میر بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر، نہال چند لاہوری کی مذہبِ عشق وغیرہ کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں گذشتہ اکائیوں میں آچکا ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر لکھی گئیں داستانوں میں انشاء اللہ خاں انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کی طویل داستانوں میں بوستانِ خیال اور طلسمِ ہوش ربا کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کی عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مگر یہاں ان پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں۔ فی الحال 'باغ و بہار' ہمارے سامنے ہے۔

باغ و بہار کا شمار اردو کی مقبول ترین داستانوں میں ہوتا ہے۔ یہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی۔ اس کا ماخذ تحسین کی نو طرزِ مرصّع ہے۔ نو طرزِ مرصع کی زبان مشکل تھی لیکن قصہ دلچسپ تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے پروفیسر گل کرسٹ کی خواہش تھی کہ یہ قصہ دوبارہ لکھا جائے جس کی زبان آسان ہو۔ میر امن نے باغ و بہار لکھ کر گل کرسٹ کی یہ خواہش پوری کردی۔

گذشتہ اکائی کے مطالعے کے دوران یہ بات آپ کے علم میں آچکی ہے کہ میر امن کے آبا واجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ خود میر امن نے بھی دہلی میں ہی آنکھیں کھولیں۔ یہیں پلے بڑھے۔ معاشی مجبوری نہ ہوتی تو ان کی ساری زندگی دہلی ہی میں گزرتی۔ لیکن جب دہلی کے حالات خراب ہوئے تو تلاشِ معاش میں اوروں کی طرح، میر امن کو بھی دہلی سے باہر نکلنا پڑا۔ وہ مع اہل وعیال پہلے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ کئی برس وہاں قیام کرنے کے بعد، کلکتہ پہنچ کر قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

کلکتہ میں کچھ دنوں بے کار رہنے کے بعد بالآخر وہ نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی کے اتالیق مقرر ہوئے۔ دو برس تک وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر میر بہادر علی حسینی کے توسط سے ڈاکٹر گل کرسٹ تک پہنچے اور فورٹ ولیم کالج میں نائب منشی کے عہدے پر بحال ہوئے۔ چالیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ زندگی آرام سے بسر ہونے لگی۔

فورٹ ولیم کالج میں میر امن نے ''باغ و بہار'' کے علاوہ ''گنج خوبی'' کے نام سے ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی کتاب ''اخلاقِ محسنی'' کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا لیکن ان کی شہرت کا دارومدار ''باغ و بہار'' ہی پر ہے۔ اس کتاب پر انھیں کالج کاؤنسل نے پانچ سو روپے انعام میں دیے تھے۔

8.3 باغ و بہار کے جملہ پہلوؤں کا مطالعہ

باغ و بہار میں چار درویشوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ فارسی کا مشہور قصہ ہے جو میر امّن سے قبل تحسین کی ''نو طرز مرصّع'' میں پیش کیا جاچکا تھا۔ میر امن نے تحسین کی کتاب کو سامنے رکھ کر اس قصے کو آسان زبان میں لکھ ڈالا۔ گویا قصہ پرانا تھا لیکن زبان نئی تھی۔ طرزِ بیان بھی نیا اور دل نشیں تھا۔ کتاب بے حد پسند کی

گئی۔ آج بھی اس کی مقبولیت برقرار ہے۔

سچ پوچھیے تو جس طرح میر امن کا اندازِ بیان پر کشش ہے، اسی طرح چار درویشوں کا یہ قصہ بھی مزے دار ہے۔ قصّہ کچھ اس طرح ہے۔

پرانے زمانے میں ملک روم میں ایک بادشاہ تھا۔ آزاد بخت اس کا نام تھا۔ دنیا کی ہر خوشی اسے میسر تھی۔ بس غم تھا تو یہی کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ عمرِ عزیز کے چالیس سال گزر گئے تو ایک دن بادشاہ کو یکا یک خیال آیا کہ یہ بادشاہت کس کام کی۔ جوانی رخصت ہوئی۔ جانے کب موت کا پیغام آ پہنچے۔ پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ یہ ملک غیروں کے حصے میں آئے گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آزاد بخت کا دل کاروبارِ سلطنت سے اچاٹ ہوگیا۔ وہ گوشہ نشین ہوگیا۔ ملک میں شور ہوا کہ بادشاہ کو سلطنت کے کاموں سے دلچسپی نہ رہی۔ خیر خواہ فکر مند ہوئے کہ اس طرح تو بدامنی پھیلے گی۔ بالآخر امرا کی درخواست پر وزیرِ سلطنت نے بادشاہ کو سمجھانے کا ارادہ کیا۔ وہ آزاد بخت کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے وزیر سے اپنا غم بیان کیا تو وزیر نے اسے مشورہ دیا کہ جو سلطنت اللہ نے دی ہے، اسے چھوڑ نا ناشکری ہے۔ انصاف کے ساتھ حکومت کیجیے۔ لوگوں کی مدد کیجیے اور اپنے لیے بھی دعا کیجیے۔ اللہ کے یہاں کس چیز کی کمی نہیں ہے۔ جس نے آپ کو سلطنت دی ہے، وہ بیٹا بھی دے گا۔

وزیر کا مشورہ بادشاہ کو پسند آیا۔ ایک دن بادشاہ رات میں بھیس بدل کر قبرستان گیا۔ وہاں اس نے چار درویشوں کو بیٹھے دیکھا۔ بادشاہ چھپ کر اُن کی باتیں سننے لگا۔ پہلے درویش نے اپنی کہانی شروع کی۔ اس نے بتایا کہ وہ اصلاً ملک یمن کے ایک نامی گرامی تاجر کا بیٹا ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنی عاقبت نااندیشی کے سبب دانے دانے کو محتاج ہوگیا۔ بہن نے مدد کی، تجارت کے لیے رقم دی۔ وہ رقم بھی برباد ہوئی۔ عشق کا روگ لگا اور اب اسی عشق کے ہاتھوں وہ اس حال کو آ پہنچا ہے کہ فقیر بنا بیٹھا ہے۔

پہلے درویش کے بعد دوسرا درویش اپنی کہانی سناتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ فارس کا شہزادہ ہے۔ محبت میں ناکام ہو کر، پہلے درویش کی طرح وہ بھی خودکشی کرنا چاہتا تھا کہ ایک سوار برقعہ پوش نے اسے خودکشی سے روکا اور کہا کہ ملکِ روم جاؤ۔ وہاں تمھاری مراد پوری ہوگی۔

دوسرے درویش کا قصہ ختم ہوا تو رات بھی آخری پہر کو آ پہنچی۔ بادشاہ محل کو لوٹ آیا۔ دن نکلا تو بادشاہ نے ان درویشوں کو محل میں بلوایا۔ عزت سے بٹھایا۔ ان کے خوف کو دور کرنے کے لیے خود بھی ایک قصہ سنایا اور ان سے بھی ان کی سرگزشت سنی۔

آخر میں جب درویشوں کی آپ بیتی مکمل ہوتی ہے تو بادشاہ کو خبر ملتی ہے کہ اس کے گھر بیٹا ہوا ہے۔ جشن کا اعلان ہوتا ہے۔ پورا ملک خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ اسی درمیان ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ یکا یک شہزادہ محل سے غائب ہوگیا۔ خوشی کی جگہ غم نے لے لی۔ دو دن اسی عالم میں گزرے۔ تیسرے دن بادل کا ایک ٹکڑا آیا اور شہزادے کو پہنچا گیا۔ بادشاہ کی جان میں جان آئی لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں کیا بھید ہے۔

ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو بادل کا ٹکڑا آتا اور شہزادے کو لے جاتا اور حسبِ دستور پہنچا جاتا۔ یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔ بعد میں پتا چلا کہ جنوں کا بادشاہ ملک شہپال بادل کا ٹکڑا بھیج کر شہزادے کو منگواتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شہپال نے اپنی بیٹی کے لیے شہزادے کو پسند کیا ہے۔

شہپال کی مدد سے چاروں درویش بھی اپنی مراد کو پہنچتے ہیں اوراس طرح داستان اختتام کو پہنچتی ہے۔

اس قصے کا اصل مزا تو جب ہے کہ آپ خود پوری کتاب پڑھیں اور دیکھیں کہ کس طرح میر امن نے مزے لے لے کراسے بیان کیا ہے۔

فی الوقت میر امن کے طرزِ تحریر سے روشناس ہونے کے لیے ہم نے ''باغ و بہار'' کے ابتدائی صفحات کا انتخاب کیا ہے۔دیکھیے درجِ ذیل اقتباس میں کہنے والے نے کس طرح اپنی بات کہی ہے۔

8.3.1 'باغ و بہار' کا منتخبہ متن:

(اقتباس)

اب آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سَیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت اور شہرِ قسطنطنیہ (جس کو استنبول کہتے ہیں) اس کا پائے تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفّہ، غریب غربا آسودہ، ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اُٹھائی گیرے، دغاباز تھے، سب کو نیست و نابود کر کر نام ونشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے، کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کَے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو؟

اُس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان نعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہیے سب موجود تھا، لیکن فرزند سے محروم تھا کہ جو زندگانی کا پھل ہے اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اس خاطر اکثر فکر مند رہتا اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ ''اے اللہ! مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا لیکن ایک اس اندھیرے گھر کو دِیا نہ دیا۔ یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے، ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور اِس سلطنت کا نشان قائم رہے۔

اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہوگئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے، ایک بارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ہیں تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مُقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچا کیا کہ افسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا، اب تیرے کس کام آوے گا! آخر یہ سارا مال و اسباب کوئی دوسرا اُڑاوے گا۔ تجھے تو پیغام موت کا آ چکا۔ اگر کوئی دن جیے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث چھتر اور تخت کا پیدا ہوا۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے، اس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔

'باغ و بہار' کی تدریس منتخبہ متن کے حوالے سے

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر، پائیں باغ میں جا کر سب مجرائیوں کو جواب دے کر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے، سب دیوان عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں۔ یہ کہہ کر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مصلا بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گزرے۔ شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی پیتے اور تمام دن رات جانماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باہر چرچا پھیلا۔ رفتہ رفتہ تمام ملک میں خبر ہوگئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مفسدوں نے سر اٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاہا ملک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے، ان کے حکم میں خللِ عظیم واقع ہوا۔ ہر ایک صوبے سے عرضی بدعملی کی حضور میں پہنچی۔ درباری، امرا جتنے تھے، جمع ہوئے اور صلاح مصلحت کرنے لگے۔

آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر عاقل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مقرب اور معتمد ہے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے، اس کی خدمت میں چلیں، دیکھیں وہ کیا مناسب جان کر کہتا ہے۔ سب ہی امیر وزیر کے پاس آئے اور کہا: بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی وہ حقیقت۔ اگر چندے اور تغافل ہوا تو اس محنت کا ملک لیا ہوا مفت میں جاتا رہے گا، پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پرانا، قدیم نمک حلال اور عقل مند، نام بھی خردمند، اسم بامسمیٰ تھا، بولا: اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنے کو منع کیا ہے لیکن تم چلو، میں بھی چلتا ہوں، خدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے، جو روبرو بلاوے۔ یہ کہہ کر سب کو اپنے ساتھ دیوانِ عام تلک لایا۔ ان کو وہاں چھوڑ کر آپ دیوانِ خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں محلّی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ پیر غلام حاضر ہے، کئی دنوں سے جمالِ جہاں آرا نہیں دیکھا، امیدوار ہوں کہ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔ یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سنی، از بس کہ قدامت اور خیر خواہی اور تدبیر اور جاں نثاری اس کی جانتے تھے اور اکثر اس کی بات مانتے تھے، بعد تامل کے فرمایا: خردمند کو بلا لو۔ بارے جب پروانگی ہوئی، وزیر حضور میں آیا، آداب بجالایا اور دست بستہ کھڑا رہا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے کہ زار بہ زار رونے اور دبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔

خردمند کو تاب نہ رہی، بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے سر اُس کا اٹھایا اور فرمایا: لو مجھے دیکھا؟ خاطر جمع ہوئی؟ اب جاؤ، زیادہ مجھے نہ ستاؤ۔ تم سلطنت کرو۔ خردمند سن کر ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کی: غلام کو آپ کے تصدق اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسر ہے لیکن جہاں پناہ کی یک بہ یک اس طرح کی گوشہ گیری سے تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا ہے اور انجام اس کا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاجِ مبارک میں آیا؟ اگر اس خانہ زادِ موروثی کو بھی محرم اس راز کا کیجیے تو بہتر ہے، جو کچھ عقلِ ناقص میں آوے، التماس کرے۔ غلاموں کو جو یہ سرفرازیاں بخشی ہیں، اسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و آرام کریں اور نمک پرورد تدبیر میں ملک کی رہیں۔ خدانخواستہ جب فکر مزاجِ عالی کے لاحق ہوئی تو بندہ ہائے بادشاہی کس دن کام آویں گے!

بادشاہ نے کہا: سچ کہتا ہے، پر جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے۔ سن اے خردمند! میری ساری عمر اسی ملک گیری کے دردِ سر میں کٹی، اب یہ سن و سال ہوا، آگے موت باقی ہے، سو اس کا بھی پیغام آیا کہ سیاہ بال سفید ہو چلے۔ وہ مثل ہے: ساری رات سوئے، اب صبح کو بھی نہ جاگیں! اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا جو میری خاطر جمع ہوتی، اس لیے دل سخت اداس ہوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا۔ جس کا جی چاہے ملک لے یا مال

لے، مجھے کچھ کام نہیں بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور منہ اپنا کسو کو نہ دکھاؤں، اسی طرح یہ چندروز کی زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھ کر بندگی اپنے معبود کی بجالاؤں گا۔ شاید عاقبت بہ خیر ہو۔ اور دنیا کو تو خوب دیکھا، کچھ مزہ نہ پایا۔ اتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چپ ہوئے۔

خِردمند اُن کے باپ کا وزیر تھا۔ جب یہ شہزادے تھے تب سے محبت رکھتا تھا۔ علاوہ دانا اور نیک اندیش تھا، کہنے لگا: خدا کی جناب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم میں پیدا کیا، تمھیں اولاد دینی اس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے۔ قبلۂ عالم! اس تصور باطل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے گا، اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمھارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے، ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا، خدانخواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پر بھی بازپُرس روزِ قیامت کی ہوا چاہے کہ تجھے بادشاہ بنا کر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا، تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران پریشان کیا، اس سوال کا کیا جواب دوگے؟

8.3.2 باغ و بہار کے منتخبہ متن کی تشریح:

داستان شروع کرنے کے لیے میر امن نے ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے جیسے وہ کوئی قصہ سنا رہے ہوں اور سننے والے سن رہے ہوں۔

عام طور سے داستانوں کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے۔ میر امن نے بھی اسی طرز کی پیروی کی ہے۔ لیکن آسان زبان اختیار کی ہے تا کہ سننے یا پڑھنے والے کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

آزاد بخت نہایت سخی اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ ملکِ روم پر اس کی حکومت تھی اور قسطنطنیہ اس کا دارالسّلطنت تھا۔ ہر طرف خوش حالی تھی۔ حتیٰ کہ غربا بھی آسودہ تھے۔ لوگ بے فکری سے سفر کرتے۔ نہ مال لٹنے کا ڈر، نہ چوری کا اندیشہ۔ رات رات بھر گھروں کے دروازے کھلے رہتے۔

بادشاہ کی حکومت دور دور تک قائم تھی۔ یہاں تک کہ دوسرے سلاطین بھی آزاد بخت کی خدمت میں خراج پیش کیا کرتے تھے۔ اس قدر رعب ودبدبے کے باوجود، وہ مزاجاً بڑا نرم تھا۔ اس کے دل میں خدا کا خوف تھا اور رعایا کا خیال بھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہ رہتا۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ البتہ اس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس وجہ سے بادشاہ اکثر فکر مند رہتا۔

وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی عمر چالیس سال ہوگئی۔ ایک دن اس کی نظر آئینے پر پڑی تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا۔ دل اداس ہوگیا۔ خیال ہوا کہ اب کوئی دن میں بڑھاپا آ جائے گا۔ میرے بعد یہ حکومت کس کے کام آئے گی۔ کوئی اولاد بھی تو نہیں! افسوس!

دل اتنا اداس ہوا کہ اسی وقت کاروبارِ سلطنت سے کنارہ کشی کا فیصلہ کرلیا۔ ایک مکان میں بیٹھ کر یادِ خدا میں مصروف ہوا۔ کسی کو اس کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔

یہ خبر عام ہوئی تو دشمنوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ ملک کے انتظام میں خلل واقع ہوا۔ خیر خواہوں کو فکر ہوئی کہ

اس طرح تو سارا ملک ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آخر کار سب مل کر وزیر کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ وہ بادشاہ کو گوشۂ تنہائی سے نکالے۔

'باغ و بہار' کی تدریس منتخبہ متن کے حوالے سے

خردمند وزیر بھی اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ وہ سلطنت کا پرانا نمک خوار تھا۔ بادشاہ آزاد بخت کے والد کے زمانے سے وہ سلطنت کا وزیر تھا۔ اس لیے آزاد بخت بھی اس کا لحاظ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وزیر نے ملاقات کی عرضی بھیجی تو بادشاہ انکار نہ کر سکا۔

وزیر حاضرِ خدمت ہوا تو بادشاہ کی صورت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چند دنوں میں ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ وزیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پوچھا - جہاں پناہ! کون سی فکر آپ کو کھائے جا رہی ہے؟ یہ آپ کی کیا حالت ہو گئی ہے!

بادشاہ نے جواب دیا - اتنی زندگی گزر گئی، بال سفید ہو چلے مگر اب تک ایک بیٹا نہ ہوا۔ آخر ایک دن مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ باقی زندگی یادِ خدا میں بسر کی جائے۔ دنیا کو خوب دیکھ لیا۔ اب عاقبت کی فکر ہے۔ یہ سن کر وزیر نے بادشاہ سے کہا - آپ کو نا امید نہ ہونا چاہیے۔ جس نے اٹھارہ ہزار عالم کو پیدا کیا، اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ آپ کو اولاد عطا فرمائے۔ اللہ نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے تو اس بادشاہت کی حفاظت کرنا بھی آپ کی ذمہ داری ہے۔ کتنی محنت اور مشقت سے بزرگوں نے اور آپ نے اس ملک کی بنیاد مضبوط کی ہے۔ ذرا سی غفلت سے ملک ہاتھ سے نکل جائے گا تو قیامت کے دن خدا کو کیا جواب دیں گے۔ جب خدا پوچھے گا کہ ہم نے اتنا بڑا ملک تمھارے حوالے کیا تھا اور اتنے سارے بندوں کی حاجتوں کو تم سے وابستہ کیا تھا۔ لیکن تم نے اپنے فرائض سے کوتاہی برتی تو آپ کیا جواب دیں گے۔ اگر خدا نے پوچھا کہ تم ہماری رحمت سے کیوں مایوس ہوئے تو آپ کیا کہیں گے۔

8.3.3 میر امّن کا طرزِ تحریر:

میر امن کا طرزِ بیان سادہ، سلیس اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ وہ بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہندی الفاظ بھی ان کی تحریر میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس اقتباس میں بھی ایسے کئی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً دیا (بہ معنی چراغ)، نام لیوا، پانی دیوا وغیرہ۔

ان کے یہاں عربی فارسی الفاظ کی بھی کمی نہیں۔ اقتباس کا مطالعہ کرتے وقت ایسے بہت سے عربی فارسی الفاظ پر آپ کی نظر ٹھہر گئی ہوگی۔ بعض لفظ کے معنی بھی آپ کو معلوم نہ ہوں گے۔ ایسے الفاظ کے معنی فرہنگ میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ میر امن کا کمال یہ ہے کہ وہ عربی فارسی الفاظ کو بڑی خوبی سے متن میں کھپاتے ہیں۔ ان کی عبارت کی روانی بہر حال برقرار رہتی ہے، خواہ عربی فارسی کے الفاظ آئیں یا ہندی کے الفاظ آئیں۔

اس اقتباس میں دنیا کی بے ثباتی کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ چالیس سال زندہ رہیں یا سو سال، آخر ایک دن مر جانا ہے۔ بادشاہ آزاد بخت کو خیال آتا ہے کہ جب ایک دن مرنا ہی ہے تو پھر یہ سارا جنجال کس لیے۔

حیاتِ مختصر کی تلقین کے ساتھ ساتھ وزیر کی زبان سے یہ نصیحت بھی کی گئی ہے کہ زندگی ہے تو ذمے داریاں بھی ہیں۔ دنیا میں آئے ہیں تو ہمیں اپنے حصے کا کام کرنا ہوگا۔ ہم اپنے فرائض سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ اگر ہم نے اپنی ذمے

داریوں سے غفلت برتی تو قیامت کے دن اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

اس اقتباس میں یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ آدمی کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ہمیں اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے اور امید کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا چاہیے۔دنیا امید پر قائم ہے۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں

- آپ کو میرامن کے بارے میں بنیادی باتیں معلوم ہوئیں۔
- آپ 'باغ و بہار' کے قصے کے جملہ پہلوؤں سے واقف ہوئے۔
- آپ 'باغ و بہار' سے لیے گئے اقتباس کا مطالعہ کیا۔
- آپ نے فرہنگ کے توسط سے باغ و بہار کے منتخبہ متن کے مشکل الفاظ کے معنی ومفہوم کو سمجھا۔
- آپ میرامن کے طرزِ تحریر سے واقف ہوئے۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1- باغ و بہار سے قبل، شمالی ہند میں لکھی گئی چار داستانوں کے نام بتائیے۔

2- فورٹ ولیم کالج کی مشہور داستانیں کون کون سی ہیں؟

3- باغ و بہار کے علاوہ، میرامن کی دوسری کتاب کون سی ہے؟

4- باغ و بہار کس کی فرمائش پر لکھی گئی تھی؟

5- باغ و بہار کی نثر کیسی ہے؟

8.6 سوالوں کے جوابات

1- باغ و بہار سے قبل شمالی ہند میں جو داستانیں لکھی گئیں ان میں سے چار اہم داستانیں 'قصہ مہر افروز و دلبر، نوطرزِ مرصّع، نوآئینِ ہندی اور عجائب القصص ہیں۔

2- فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں میرامن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، میر بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر وغیرہ مشہور داستانیں ہیں۔

3- باغ و بہار کے علاوہ میرامن نے ''گنجِ خوبی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ ملا واعظ حسین کاشفی کی ''اخلاقِ محسنی'' کا اردو ترجمہ ہے۔

4- ''باغ و بہار'' گل کرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔

5- باغ و بہار کی نثر سادہ، سلیس اور دل نشیں ہے۔ یہ بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے۔اس میں دہلی کا روزمرہ ہے۔

8.7 فرہنگ

آغاز	شروع، ابتدا
رعیت	محکوم، رعایا
معمور	بھرا ہوا
مُرفّہ	آسودہ
صبح خیزے (صبح خیزا کی جمع)	سوتے ہوئے مسافروں کا مال چرا لے جانے والے
اٹھائی گیرے (اٹھائی گیرا)	اُچکا، آنکھ بچا کر چھوٹی چھوٹی چیزیں چرا لے جانے والا
آب دیدہ ہونا (محاورہ)	آنکھوں میں آنسو بھر آنا، غمگین ہونا
نعل بندی	خراج - وہ مقررہ رقم جو بادشاہ کی خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش کی جائے
مُقیش	سونے چاندی کے تاروں کا بنا ہوا کپڑا جیسے زری، بادلا وغیرہ
حِرص	لالچ
زیروزبر کرنا	درہم برہم کرنا
وارث	میراث لینے والا، جانشیں
مُجرائی	آداب بجالانے والا، منصب دار، درباری
دیوانِ عام	دربارِ عام، عام دربار کا مکان
پیر	بوڑھا
غنیم	لٹیرا، دشمن
مُفسِد	فساد کرنے والا
سرکشی	نافرمانی، بغاوت
اُمرا	امیر کی جمع، سردار
عاقل	عقل مند
دانا	عقل مند
مُقرب	وہ شخص جسے قربت حاصل ہو
مُعتَمد	جس پر اعتبار کیا گیا ہو
عمدہ	سردار، اعلیٰ عہدے دار
چندے	کچھ عرصہ، کچھ روز
تغافل	لاپرائی، جان بوجھ کر غفلت کرنا
اسم بامسمّٰی	جیسا نام ویسی ہی صفت

تلک	تک (اب تلک کی بجائے تک بولتے ہیں)
محلّی	خواجہ سرا- وہ غلام جو حرم سرا میں آتے جاتے تھے
ازبس کہ	چوں کہ
تامّل	سوچ بچار
خاطر جمع	اطمینان، تسلی
خانہ زاد	غلام (انکسار کے طور پر بولتے ہیں)
مَحرم	واقف، بھید جاننے والا
لاحِق ہونا	چمٹنا، وابستہ ہونا
بندگی	تابع داری، غلامی
ہیژ دہ	اٹھارہ
عالَم	دنیا
باطل	جھوٹا
خدانخواستہ	خدا نہ کرے
بازپرس	پوچھ گچھ

8.8 کتب برائے مطالعہ

اردو کی نثری داستانیں	گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء
باغ و بہار	ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی (مرتّب)	
ہماری داستانیں	وقار عظیم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان، نئی دہلی
باغ و بہار (تحقیق و تنقید کے آئینہ میں)	مقدمہ سلیم اختر	اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ	امام مرتضیٰ نقوی	اردو پبلشرز تلک مارگ لکھنؤ ۱۹۷۸ء
فرہنگِ باغ و بہار	ساجدہ قریشی	اسلامک ونڈرس بیرونئی دہلی 2015ء
میر امن (مونوگراف)	ابن کنول	اردو اکادمی دہلی ۲۰۱۲ء

اکائی 9 میر امّن دہلوی کی نثر نگاری اور گنجِ خوبی

ساخت

9.1 اغراض و مقاصد

9.2 تمہید

9.3 میر امّن دہلوی کی نثر نگاری اور گنجِ خوبی

9.3.1 میر امّن دہلوی کی نثر نگاری

9.3.2 گنجِ خوبی کا منتخب متن (اقتباس)

9.4 آپ نے کیا سیکھا

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالوں کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض و مقاصد

اس اِکائی میں آپ

- داستان کے فن سے متعارف ہوں گے۔
- میر امّن کی داستان نگاری کی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔
- گنجِ خوبی کی مجموعی خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔
- گنجِ خوبی سے لیے گئے اقتباسات کا مطالعہ کریں گے۔

9.2 تمہید

داستان عام طور پر ایک طویل اور مسلسل قصے کو کہتے ہیں۔ داستان میں واقعات کو پُرکشش انداز میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور تجسس برقرار رہے۔ داستان میں سیدھی سادی باتوں کے علاوہ مافوق الفطرت واقعات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میں شہزادوں، پریوں کی ملاقاتیں، زندگی کی چھوٹی بڑی وارداتیں، پیچیدگیاں اور حیرت انگیز باتیں ہوتی ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی اور ماقبل قصے سے ربط داستان کے لیے ضروری ہے۔ عام طور سے داستانوں میں قصہ در قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اردو کی بہت سی داستانیں سنسکرت زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ داستانیں عرب اور ایران پہنچیں۔ عربی اور فارسی میں ان کے ترجمے ہوئے۔ بتیال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی اور گل بکاؤلی وغیرہ اسی قبیل کی داستانیں ہیں۔ کچھ داستانیں عرب اور ایران میں تصنیف

ہوئیں اور یہاں ان کے ترجمے ہوئے مثلاً سب رس، الف لیلیٰ وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ داستانیں فارسی میں لکھی گئیں، اردو میں ان کے ترجمے کیے گئے جیسے داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا اور قصہ چہار درویش۔ کچھ داستانیں جیسے فسانۂ عجائب اور طوطا کہانی اصلاً اردو میں ہی لکھی گئیں۔

9.3 میرامن کی نثر نگاری اور گنجِ خوبی

9.3.1 میرامن کی نثر نگاری:

میرامّن اپنی تصانیفِ نثر باغ و بہار اور گنجِ خوبی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ میرامّن دراصل فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے، اس کالج کی بہت اہمیت ہے۔ فورٹ ولیم کالج انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے قائم ہوا تھا، اس لیے یہاں جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ عام فہم، آسان اور بول چال کی زبان میں لکھی گئیں۔ میرامّن نے اس پر فخر کیا ہے کہ انہوں نے باغ و بہار بولی ٹھولی کی زبان میں لکھی ہے۔ یہاں قصے کہانیوں کی کتابیں لکھنے پر زیادہ زور دیا گیا اور ترجمے کا کام بھی کیا گیا۔ کالج کی کتابوں میں میرامّن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل، مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشنِ ہند، میر شیر علی افسوس کی باغِ اردو، مرزا کاظم علی جوان کے ڈرامہ شکنتلا اور للولال جی کی سنگھاسن بتیسی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

میرامّن فورٹ ولیم کالج میں 4/مئی 1781ء کو چالیس روپے ماہوار پر ماتحت منشی مقرر ہوئے، لیکن 1806ء میں بے حد ضعیف اور ناتواں ہوگئے تو انہیں کالج کی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ میرامّن بنیادی طور پر اپنی تصانیف 'باغ و بہار' اور گنجِ خوبی کی وجہ سے مشہور ہیں، لیکن ان دونوں میں جو شہرت باغ و بہار کو حاصل ہوئی وہ گنجِ خوبی کو نہ ہوسکی۔

گارساں دتاسی کے قول کے مطابق گنجِ خوبی سب سے پہلے ناگری رسم الخط میں 1805ء میں کلکتے سے شائع ہوئی، اس کے بعد وہ اردو میں 1846ء میں کلکتے سے طبع ہوئی۔ باغ و بہار کے زیادہ مشہور ہونے کی اہم وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دلچسپ داستان ہے جس میں قصہ در قصہ بیان کیا گیا ہے اسی وجہ سے قاری کی دلچسپی اور تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ جبکہ گنجِ خوبی ایک اخلاقی صحیفہ ہے، لیکن میرامّن نے گنجِ خوبی میں بھی دہلی کے روزمرّہ کو بے حد سلیقے سے استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اردو نثر نے ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کرلی تھیں۔ گنجِ خوبی میں بھی میرامّن نے بول چال کی زبان کا استعمال نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ گنجِ خوبی میں جگہ جگہ ضرب الامثال کو استعمال کیا گیا ہے۔ بعض امثال رائج الوقت امثال سے مختلف ہیں اس لیے توجہ کی حامل ہیں:

(۱) دور کے ڈھول سہاؤنے

(۲) کیا پدری کیا پدری کا پلپو

(۳) نہ تیر نہ کمان ناحق کا پٹھان

(۴) میرے تلوے دیکھ کر اور کا منہ نہ دیکھے

(۵) اکیلا اکیلا ہے اور دو آدمی کو کہتے ہیں ایک اور ایک گیارہ

(۶) پانچ پنچ مل کیجیے کاج، ہارے کھاگے آوے نہ لاج

(۷) مرد مرے نام کو، نامرد مرے نان کو

(۸) جیب کی کہوں یا تلوے کی

میرامّن کی تحریر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ عام ہندی الفاظ کو سلیقے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور کبھی ان سے ایسے مصادر بنا لیتے ہیں جن میں ندرت ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) چاروں طرف سے بادل گھمنڈ آیا

(۲) اس نے دہائی تہائی مچائی

(۳) بعد ایک دم کے سرت میں آیا

(۴) رعیت جوت میں دلچلی نہیں کرتی

(۵) آپ مارے شرم کے تھوڑا تھوڑا ہوا جاتا تھا

(۶) اچھی اچھی باتوں کی چونپ دلاوے

(۷) اجل کے مگرمچھ نے منہ پسارا

(۸) جوکوئی نکیا کر بولے

(۹) مناسب ملاقات کے سمجھتا تو بلاتا، نہیں تو وہیں سے بدا کرتا

(۱۰) چپکے چپکے آپس میں نہ بتیائیں

گنجِ خوبی دراصل ایک درسِ اخلاق کی کتاب ہے۔ اسلامی تعلیمات یا اخلاقیات اپنی ترقی یافتہ شکل میں بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے، اس میں ظہورِ اسلام سے قبل کی عربی روایتیں شامل ہیں، اس پر ایران، ہندوستان اور یونان کے فلسفوں کا نقش ہے۔ اس کے علاوہ اس میں قرآن مجید، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی سیرت کا بھی اثر ہے۔ تصوف کی تحریک نے اس کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخش دیا ہے۔ غرض اس کے عناصر ترکیبی مختلف اخلاقی نظاموں سے حاصل کیے گئے ہیں۔ مثلاً اسلام سے پہلے عربوں کی قبائلی زندگی تھی، ان کے قبائلی رسم و رواج تھے، اسلام نے ان رسومات و اطوار کو بالکل ختم نہیں کیا، اس کے صحت مند عناصر کو باقی رکھا بلکہ بعض اقدار کو مزید ترقی دی، مثلاً شجاعت، حلم، مہمان نوازی جن کی بنیاد مذہب نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے اخلاقی اقدار میں زبردست تبدیلی پیدا کی اور اخلاق کا سرچشمہ قرآن و حدیث بن گئیں۔ جس میں سب سے زیادہ زور خوفِ خدا اور روزِ جزا پر تھا۔ نوی صدی عیسوی میں اخلاق کی ساری بنیاد حدیث پر قائم ہوگئی، لیکن اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ایرانی اور یونانی اثرات بھی بڑھے۔ تصوف نے عقل پرستی کے خلاف اور خلوت گزینی کی تائید میں آواز اٹھائی۔ اس کی بدولت فقر و فاقہ، غنا و توکل جود و سخا اور صبر و حیا زندگی کی اہم قدریں بن گئیں۔ ایران کے اثر سے اسلام کی حیثیت ایک ریاستی مذہب کی بن گئی اور مذہب و حکومت میں چولی دامن کا ساتھ ہوگیا۔ کہیں تو ملک و دین ہم آمیز ہوگئے اور بادشاہ کی حیثیت ظل اللہ کی ہوگئی۔ لیکن غزالی نے احیاء العلوم اور نصیحۃ الملوک کے ذریعے اس نظریے کی تردید کی اور اخلاق کی بنیاد، دوبارہ تصوف، حق گوئی اور آزادی پر قائم کی۔ امام غزالی نے مختلف اخلاقی نظاموں کی کثرت میں اسلامی وحدت پیدا کی اور ان کے صحت مند عناصر کو اسلام کے اخلاق میں سمویا۔

9.3.2 'گنجِ خوبی' کا منتخب متن (اقتباس)

بارہواں باب، بابِ عزم میں:

یعنی قصدِ بلند رکھنا، کہ وہ راہ بری کر کے، منزلِ مقصود کو پہنچا دیتا ہے، اور اس کی مدد سے دل کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور جو ارادہ کرتا ہے بن آتا ہے۔ خصوصاً آج تک کسو پادشاہ نے، بغیر عزمِ درست کے، کوئی ملک عمل نہیں کیا۔ اور بدوں تکدو اور نہایت کوشش کے سلطنت کے تخت اور حکومت کی مسند کو نہیں لیا۔

بیت:

جب تک نہ کرے گا عزم پورا
رہ جائے گا کام سب ادھورا

اور عزمِ جزم اس کو کہتے ہیں کہ جس کام پر کمر باندھے یا جس مہم پر دل لگاوے، کسو کے منع کرنے سے باز نہ آوے اور کسو طرح اپنے ارادے کو موقوف نہ کرے۔

پند: ایک حکیم سے پوچھا کہ عزم پادشاہوں کا کس جگہ خوش نما ہے اور کس وقت کام آتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جب دشمن سلطنت کے پیدا ہوں، ان کے دفع کرنے کے لیے اگر یہ عزم کرے، تو نہایت خوب ہے۔ کیوں کہ جس وقت پادشاہ خدا پر توکل کر کے جنگ کے واسطے سوار ہوتا ہے تو لشکر فتح و اقبال کا اس کا استقبال کر کے جلَو میں حاضر رہتا ہے۔ اس لیے عزمِ درست، نشان غالب ہونے اور فتح پانے کا ہے۔

بیت:

عزم پکّا کر کے، شہ گھوڑے پہ جب ہووے سوار
ایسا گھبرا جاوے دشمن، ہاتھ سے چھٹ جائے باگ

تیرھواں باب: جدوجہد میں:

جِد کے معنی، سعی کرنی واسطے حاصل ہونے مطلب کے، اور جہد کے یہ معنی ہیں کہ محنت کرے اپنے مقصد کے بَر لانے میں، اور جدوجہد بھی اولالعزم پادشاہوں کے وصف اور خُلقوں میں سے ایک خُلق ہے اور جس کی ہمّت بلند ہوگی یہ صفت اس میں مقرر ہوگی اور جتنی جس کی ہمت عالی ہوگی وہ اپنے کام میں جدوجہد بہت کرے گا۔

پس، چاہیے کہ جو مرد بلند ہمت ہو، محنت اور مشقّت سے نہ ڈرے۔ کیونکہ سعی اور کوشش میں دو صورتیں پیش آتی ہیں اگر مراد بر آئی، تو کیا پوچھنا ہے، اور اگر مطلب حاصل نہ ہوا، تو عذر اس کا عاقلوں کے نزدیک پسند ہے۔ اس واسطے کہ اس کا جدوجہد سب پر ظاہر ہوا اور ہر ایک کو یقین آیا کہ اپنی طرف سے کوشش و محنت تو کی، ہونا نہ ہونا خدا کے ہاتھ میں ہے۔

بیت:

سعی کرتا ہوں، ملے مطلب، تو ہے ہمّت بلند
ورنہ ہو، تو عذر میرا ہو بزرگوں کو پسند

حکایت: کہتے ہیں کہ کسو پادشاہ نے اپنے بیٹے کو ایک دشمن پر لڑنے کے واسطے بھیجا تھا۔ خفیہ نویس نے لکھا کہ پادشاہ زادے کھسو کھسو راہ میں زرہ بدن سے اتار ڈالتے ہیں اور دو شب ایک منزل میں مقام کرتے ہیں۔ باپ نے لکھا کہ اے بیٹا! حق تعالیٰ نے جب روزِ ازل میں عزت کو پیدا کیا، رنج و محنت کو اس کے ساتھ کر دیا اور ذلت کو جو بنایا، چین اور خوشی کو اس سے ملایا۔ عزت پادشاہوں کی بخشی، اور ذلت رعیت کو دی۔ پس، عیش پادشاہ کا سلطنت کے مرتبے سے ہے اور رعیت کی قسمت میں آرام اور کم محنتی لکھ دی۔ یہ دونوں حصے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سلطان کو مقرر چاہیے کہ آسائش کو وِداع کرے اور راحت، رعیت کو چھوڑ دے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو وہی کام کرے کہ جس میں آرام پاوے اور سلطنت کے جاہ و جلال سے باز آوے، اور کچھ کسب کر کھوے۔

بیت:

بادشاہت کا مزہ کیا کم ہے، مت آرام ڈھونڈھ

سلطنت جب ہو میسر، دوسری پونجی نہ چاہ

حکایت: یعقوب لیث لڑکپن سے اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالتا اور جس کام میں خوف و خطر زیادہ ہوتا ہے، اس کی پیروی کرتا، اور اپنی جان سے نہ ڈرتا اور محنت کرنے سے ایک دم نہ آسودہ رہتا۔ لوگوں نے کہا: تو بچارا کسیرا ہے تجھے اتنی مشقت کرنے سے اور اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہے؟ بولا: مجھے افسوس آتا ہے کہ اپنی عمر عزیز کو تانبے اور ھبرت کے بنانے میں صرف کروں، اور جس کسب میں بہت سے شریک ہوں، اس میں دل لگاؤں۔ اس محنت و کوشش کرنے سے میرا یہ ارادہ ہے کہ اپنے تئیں ایسے مرتبے پر پہنچاؤں کہ میرے ہم جنسوں میں سے کوئی میرے برابر نہ ہو۔ پھر انھوں نے کہا کہ یہ بات مشکل ہے اور یہ کام کا نہایت سخت ہے۔ جواب دیا کہ میں خوب سمجھ چکا ہوں کہ نداں شربت موت کا چکھنا اور بوجھ اَجَل کا اٹھانا ہے، بہتر یہ ہے کہ کسی بڑے کام میں مروں، نہ کہ چھوٹے کام میں جان دوں۔ آخر اسی محنت اور کوشش کے سبب سے، اس درجے کو پہنچا کہ سب نے سنا ہے۔

اَبیات:

ہر کام میں سعی ہے گی درکار　　کوشش میں نہ سستی کر تو زنہار

جس کام پہ دل ترا ہو مائل　　گر سعی کرے تو ہو وہ حاصل

اور جیسے کہ جد و جہد سے نیو سرداری کی بنتی ہے، برعکس اس صفت کے کہ جھوٹ بولنا اور سستی کرنی ہے، جڑ مرتبے اور دولت کی اکھڑتی ہے۔ طاہر کی اولاد میں ایک سے کسو نے سوال کیا کہ تمہارے گھرانے سے کس باعث دولت اور سرداری جاتی رہی؟ جواب دیا کہ رات کے دارو پینے اور صبح کے سونے سے! یعنی کاہل پنے سے اپنے کاروبار کی طرف نہ متوجہ ہوئے، اور سستی کے سبب سے رسم سیاست کی اٹھا دی۔ آپ سے آپ ہمارے اختیار کی ناو لاچاری کے بھنور میں بیٹھ گئی، اور ہماری امید کی کشتی مقصد کے کنارے تک نہ پہنچی۔ یہی احوال ہندوستان کی سلطنت کا ہوا۔

بیت:

وہ اپنے ہاتھ سے دولت کی نیو کو کھودے
شراب شام سے پی کر جو صبح تک سووے

چودھواں باب ثبات میں:

یعنی قائم رہنا ہر ایک سخت کام میں اور مضبوط ہو کر دور کرنا رنج وبلا کو: سچ ہے، ثبات بہتری اور برکت کا پھل دیتا ہے، اور اس کے ہونے سے خوشی اور بے فکری کا فائدہ ملتا ہے اور کسو گروہ کو تمام خلق اللہ میں ثبات کی صفت سے اتنا کام نہیں پڑتا، جتنا پادشاہوں کو۔ اس لیے کہ جب تلک ثبات سلاطینوں کا، رعیّت اور نوکروں پر اور سرکشوں اور بدفعلوں کی بیخ کنی اور سزا دینے میں، خاص وعام پر ظاہر نہ ہو، لشکر اور چاکر ہرگز فرمانبرداری نہ کریں گے، اور سرکشی اور بدی کرنے والے، حرامزدگی اور بدذاتی نہ چھوڑیں گے۔ پس، اس صورت میں پادشاہ کو پختہ مزاجی سے بڑی قوت اور مدد ہے اور اوروں کے دل میں سلطان کے ثبات سے دہشت اور خوف رہتا ہے۔

بیت:

جوکوئی سر پہ رکھے گا ثَبات کا افسر
تو مرتبے میں بلند ہوگا چرخِ گرداں پر

پند: کسو حکیم کا قول ہے کہ جوکوئی چاہے کہ بنیاد اس کی سلطنت کی کھبو نہ خراب ہو، تو لازم ہے کہ جو کام کرے، اس میں ثبات اور مضبوط رہے۔

بیت:

تو اپنے کام کی بنیاد کو ثبات پہ رکھ
کہ نیو نیو پہ دینے سے بنتی ہے مضبوط

اور مردِ ثابت قدم اس کو کہتے ہیں کہ اپنی راہ ورسم اور قول وفعل سے باز نہ آوے، ہر چند برعکس اس کے کوئی صلاح دیوے یا ڈراوے۔ کیونکہ، مددِ غیبی، سوائے ثابت رہنے کے، نجات کی راہ نہیں دکھلاتی۔ چنانچہ حکیم الٰہی یعنی افلاطون فرماتا ہے۔

ابیات:

دو دِ لہ ہونا ، خوب بات نہیں
مرد وہ نہیں جسے ثبات نہیں
گر تو چاہے ، چڑھوں میں درجے پر
تو قدم راہ میں ثبات کی دھر

اور نشانِ ثبات کا دو چیز ہیں: ایک تو یہ کہ جو کام شروع کرے، اس کا تمام کرنا، اپنی ہمت کے ذمّے پر لازم جانے۔

حکایت: کہتے ہیں کہ قیصرِ روم نے، نوشیروانِ عادل سے پوچھا، کہ بقا سلطنت کی کس بات میں ہے؟ جواب دیا کہ میں ہرگز بیہودہ کام نہیں کرتا اور جس مہم میں قصد کرتا ہوں، اسے انجام دیتا ہوں، قیصر نے کہا: سچ ہے، سب حکیم یونان کے یہی بات کہہ گئے ہیں۔

ابیات:

مردوں کی طرح جو کام کیجیے　　لازم ہے اسے تمام کیجیے
یعنی، جو نشان تو اٹھاوے　　پھر اس کو نہ چاہیے گراوے

پندرھواں باب۔　عدالت میں:

عدل ایسا حاکم ہے کہ ملک کو آباد کرتا ہے، اور ایسا نور ہے کہ تاریکی کو برباد کرتا ہے۔ خدائے پاک اور برتر اپنے بندوں کو قرآن شریف میں فرماتا ہے، جس کا یہ ترجمہ ہے کہ ''تحقیق اللہ حکم کرتا ہے تمھیں واسطے عدل اور احسان کے،'' پس عدل کے یہ معنی ہیں کہ دادِ مظلوموں کی دیوے اور احسان اسے کہتے ہیں کہ مرہم آرام کا گھاوِ پر ظلم کے گھائلوں کے رکھے۔

حکایت: عبداللہ طاہر نے ایک روز اپنے بیٹے کو کہا: کاش کہ دولت ہمارے گھرانے میں جوں کی توں رہے! لڑکے نے جواب دیا کہ جب تک فرش عدل کا اور بچھونا انصاف کا اس محل میں بچھا رہے گا؛ وہ بھی اپنا گھر جان کر بسے گی۔

قطعہ:

جو پادشاہ تختِ عدالت پہ ہو چڑھا
سجتا ہے اس کے سر پہ چھتر شان وفخر کا
انصاف کا لباس اتارے بدن سے جب
لعنت کا طوق اس کے گلے میں لگے بھلا

پند: حکیموں کا قول ہے کہ عدل کے معنی یہ ہے کہ سب خلق اللہ کو برابر رکھے، یعنی ایک گرہ کو ایک گروہ پر زبردست نہ کرے اور ہر طائفے کو موافق اس کے مرتبے کے درجے دے، اور خدمت کرنے والے پادشاہوں کے فی الحقیقت چار فرقے ہیں: پہلے صاحبِ شمشیر، جیسے امراء اور سپاہی یہ خواص آگ کا رکھتے ہیں۔ دوسرے اہل قلم، مانند وزیر اور متصدّی کے؛ یہ مثال ہوا کے ہیں۔ تیسرے اہل معاملہ چنانچہ سوداگر اور دکان دار؛ یہ بجائے پانی کے ہیں۔ چوتھے رعیّت جو کھیتی کرتے ہیں؛ یہ برابر خاک کے ہیں۔ پس جس طرح کہ ایک عنصر چاروں عنصر میں سے دوسرے پر غالب ہوتا ہے اور مزاج انسان کا خراب ہو جاتا ہے؛ ویسے ہی، ایک گروہ کے غالب ہونے سے ان چاروں گروہ میں سے، طبیعت ملک کی بگڑ جاتی ہے، یعنی اجاڑ ہو جاتا ہے اور آراستگی عالم کی اور بندوبست خلق اللہ کا خراب اور نا آراستہ رہتا ہے۔

قطعہ:

خلق میں ہے ہر اک کا اک درجہ　　اس جہاں کی قدیم سے ہے یہ چال
اپنی حد سے جو کوئی زیادہ بڑھے　　فتنے ہر طرف سے اُٹھیں فی الحال
ہر کسو کو تو مرتبے پر رکھ　　پھر تو اپنی جگہ پہ رہ خوش حال

اور ایک فضیلت عدل کی یہ ہے، کہتے ہیں کہ سلطانِ عادل کے اعضا کو قبر کی خاک بعد مرنے کے خراب نہیں کرتی اور اثر کرنے نہیں پاتی۔

حکایت: کہتے ہیں کہ دارالملک چین میں ایک پادشاہ تھا، عدل کے زیور سے آراستہ اور درخت اس کی زندگی کا انصاف کے میوے سے پھلا ہوا۔

بیت:

عدالت سے اس کی ، ستم ناپدید
خدا خوش ،رعیّت کے تھی گھر میں عید

اتفاقاً ایک بارگی کچھ آفت ان کی سماعت میں آئی اور گرانی کانوں میں پیدا ہوئی۔سلطنت کے کارباریوں کو اور امیروں کو حضور میں جمع کیا، اور آپ ایسا زار زار روئے کہ جتنے روبہ برو حاضر تھے، ان کا کلیجہ پھٹنے لگا اور پادشاہ کا یہ احوال دیکھ کر، رونے لگے اور ان کے تسلی کے لیے تدبیر کرنے لگے۔ پادشاہ نے فرمایا کہ شاید تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں اپنے کان بہرے ہونے کے سبب سے روتا ہوں؛ سو غلط ہے۔اس واسطے کہ مجھے یقین ہے کہ آخر حواسوں کی قوت میں خلل اور نقصان آوے گا۔ پس، ان سب میں سے ایک چیز کے کم ہونے سے، عقل مند آدمی کس خاطر غمگین ہووے۔ بلکہ رونا میرا اس واسطے ہے کہ اگر کوئی مظلوم فریادی دروازے پر بارگاہ کے دہائی دیوے، اور آواز اس کی فریاد کی میرے کان میں نہ آوے، وہ یوں ہیں محروم پھر جاوے، تو میں خدا کے نزدیک پکڑا جاؤں، پھر اس وقت کیا عذر لاؤں۔اب اس بات کی میں نے ایک فکر کی ہے؛ ڈھنڈورا پھروادو کہ آج سے کوئی شخص سوائے فریادی کے سرخ پوشاک نہ پہنے، تو میں اس نشان سے مظلوموں کو پہچان لیا کروں اور انصاف ان کا دیا کروں۔

بیت:

داد مظلوموں کی دے ، مطلب غریبوں کا نکال
دین ودنیا کو اسی دادودہش سے تو سنبھال

9.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اِکائی میں

- آپ اردو میں داستان گوئی کی روایت سے واقف ہوئے۔
- آپ نے میرامّن کی نثر نگاری کا جائزہ لیا۔
- آپ گنجِ خوبی کے اسلوب سے واقف ہوئے۔
- آپ نے گنجِ خوبی (اقتباس) کی جملہ خصوصیات کا جائزہ لیا۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1- میرامّن کس کالج سے وابستہ تھے؟

2- 'گنجِ خوبی' کس سنہ میں اور کہاں شائع ہوئی؟

3- میرامّن کی مشہور داستان اور اخلاقی صحیفہ کا نام بتائیے۔

4- میرامّن کی نثر کی دو اہم خصوصیات کیا ہیں؟

5- 'گنجِ خوبی' کے جو اقتباس شامل کیے گئے ہیں ان کے عنوان تحریر کیجیے۔

9.6 سوالوں کے جوابات

1- میرامّن فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے۔

2- گنجِ خوبی اردو میں 1846ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔

3- میرامّن کی مشہور داستان 'باغ و بہار' ہے اور اخلاقی صحیفہ 'گنجِ خوبی' ہے۔

4- روزمرّہ دہلی کا استعمال، عام ہندی الفاظ کا استعمال، میرامّن کی نثر کی اہم خصوصیات ہیں۔

5- گنجِ خوبی' کے جو اقتباس اس اکائی میں شامل کیے گئے ہیں ان کے عنوان عزم میں، جدوجہد میں، ثبات میں، عدالت میں ہیں۔

9.7 فرہنگ

قصد	ارادہ
تکدو	تگ ودو، کوشش
نشان	علامت
سعی	کوشش
توکل	بھروسہ (اللہ پر بھروسہ کرنا)
عذر	وجہ، بہانہ
رعیّت	عوام
کسب	ذریعۂ معاش، کاروبار
اَجَل	موت
نیو	بنیاد

چرخ	آسمان
دودِلہ ہونا	شک وشبہ ہونا، تذبذب میں ہونا
عدل	انصاف
ناپدید	ناپید، غائب
دادودہش	سخاوت

9.8 کتب برائے مطالعہ

گنجِ خوبی	میرامّن دہلوی	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔1966
اردو داستان (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر سہیل بخاری	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء
میرامن دہلوی حیات وتالیف	نفیس جہاں بیگم	جمال پرنٹنگ پریس دہلی 1986
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

اکائی 10 باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا تعارف

10.3.1 'باغ و بہار'

10.3.2 'فسانۂ عجائب'

10.3.3 میرامن اور رجب علی بیگ سرور

10.4 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا اسلوب

10.4.1 'باغ و بہار' کا اسلوب

10.4.2 'فسانۂ عجائب' کا اسلوب

10.5 باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ

10.6 آپ نے کیا سیکھا

10.7 اپنا امتحان خود لیجیے

10.8 سوالوں کے جوابات

10.9 فرہنگ

10.10 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔
- میرامن اور رجب علی بیگ سرور کی داستان نگاری سے متعارف ہوں گے۔
- 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کے اسالیب کو جان سکیں گے۔
- 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ کریں گے۔
- 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' میں جس معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اس سے بھی متعارف ہوں گے۔

10.2 تمہید

اردو میں افسانوی نثر کی ابتدا داستانوں سے ہوتی ہے، داستانوں کی عہد حاضر میں اہمیت کی ایک بڑی وجہ اس

میں اپنے عہد کی زبان اور معاشرت کا بیان ہے۔ ہر داستان اپنے زمانے کے اسلوب اور تہذیب کی عکاس ہے۔ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب میں جس قدر مفصل تہذیب کا عکس نظر آتا ہے، کسی اور صنف ادب یا تاریخ میں کم دکھائی دیتا۔ اسلوب کے اعتبار سے دونوں داستانیں مختلف ہیں۔

10.3 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا تعارف

10.3.1 باغ و بہار:

''باغ و بہار'' فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی ایک اہم داستان ہے، جس کے مؤلف میر امن دہلوی ہیں۔ ''باغ و بہار'' اپنے سلیس اور سادہ اسلوب اور دہلوی تہذیب کے مرقعوں کے لیے مشہور ہے، ''باغ و بہار'' اس کا تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۱۷ھ نکلتا ہے۔ ''باغ و بہار'' پہلی بار ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ''باغ و بہار'' کا قصہ محمد شاہ کے زمانے میں فارسی میں لکھا گیا، ''باغ و بہار'' انیسویں صدی میں بھی بہت مقبول رہی اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے اردو میں نہ صرف متعدد ایڈیشن شائع ہوئے بلکہ مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، ''باغ و بہار'' کا قصہ اگرچہ پرانا تھا لیکن میر امن کے سلیس اور بامحاورہ انداز بیان نے اسے نیا رنگ و روپ دے کر تاریخ ادب اردو کا ایک اہم قصہ بنا دیا۔

10.3.2 فسانۂ عجائب:

اردو کی چند نمایاں داستانوں میں سے ایک ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔ تحسین نے ''نوطرز مرصّع'' کی شکل میں اردو نثر کو جو انداز بیان دیا تھا۔ ''فسانۂ عجائب'' اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کی اہمیت اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہے، اپنے مسجّع، مقفّیٰ اور مرصّع انداز بیان کی وجہ سے سرور ''باغ و بہار'' کے مصنف میر امّن کے ادبی حریف بھی سمجھے جاتے ہیں ''فسانۂ عجائب'' کی تالیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں سرور اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وقت گذاری کے لیے کسی دوست نے اُن سے کسی قصے کی فرمائش کی۔ سرور نے ایک قصہ بیان کیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک قتل کے الزام میں انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔ سرور کو لکھنؤ چھوڑ کر کانپور جانا پڑا۔ لکھنؤ اور دوستوں کی جدائی کے غم کو فراموش کرنے کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا اور اسی سال یعنی 1240ھ بمطابق 1824 میں ''فسانۂ عجائب'' کو تصنیف کیا۔ ''فسانۂ عجائب'' رجب علی بیگ سرور کا طبع زاد قصّہ ہے، لیکن اس عہد میں رائج دوسرے قصوں سے مختلف نہیں ہے۔

10.3.3 میر امن اور رجب علی بیگ سرور:

میر امن دہلی کے رہنے والے تھے، میر امن کی ولادت اور وفات کا علم کسی تذکرہ یا کتاب سے معلوم نہیں ہوتا، اندازے کے مطابق کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۷۴۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۶ء میں انتقال ہوا۔ ۹۹-۱۷۹۸ء میں میر امن روزگار کی تلاش میں تنہا کلکتہ پہنچے اور نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق مقرر ہوئے، دو سال تک وہاں ملازمت کی۔ پھر میر بہادر علی حسینی کے ذریعہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ تک پہنچے اور فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کی۔ میر امن نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران ''باغ

وبہار‘‘اور’’گنج خوبی‘‘دو کتابیں لکھیں۔’’باغ وبہار‘‘قصہ چار درویش‘‘اور’’گنج خوبی‘‘’’اخلاق محسنی‘‘ کا اردو ترجمہ ہے۔

سرور لکھنؤ میں 1200ھ بمطابق 1786 کے آس پاس پیدا ہوئے۔مرزا اصغر علی بیگ اُن کے والد کا نام تھا۔ سرؔور کے خاندان کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتیں۔مخؔمور اکبرآبادی نے سرؔور کا آبائی وطن اکبرآباد لکھا ہے،لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت دستیاب نہیں ہے۔اس عہد کے رواج کے مطابق سرؔور نے بھی عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی،سرؔور کے ادبی سفر کا آغاز’’فسانۂ عجائب‘‘(1240ھ) سے ہوتا ہے اور اس کے بعد’’شگوفہ محبت‘‘،’’گلزار سرور‘‘،’’شبستان سرور‘‘ جیسی داستانیں اُن کا قلم تحریر کرتا ہے۔’’شرر عشق‘‘ کے نام سے سرؔور نے ایک مختصر قصہ بھی لکھا۔’’فسانۂ عبرت‘‘ نام کی کتاب میں سرؔور نے اودھ کی مختصر تاریخ بیان کی ہے،اس میں اودھ کے آخری چار بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔تاریخی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہم ہے۔فارسی کی ایک اور کتاب’’شمشیر خانی‘‘ کو بھی سرؔور نے’’سرور سلطانی‘‘ کا نام دے کر ترجمہ کیا۔یہ کتاب سرؔور کی زندگی کے آخری ایام کی دین ہے۔اودھ کے نوابوں سے قربت بھی رہی اور ناراضگی بھی۔ناراضگی کے سبب جلاوطنی کے دن بھی گذارنے پڑے۔سرؔور نے اپنی طویل عمر میں لکھنؤ کے نوابوں کا عروج و زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔واجد علی شاہ کی حکومت کے بعد سرؔور کی پریشانی کے دن شروع ہوگئے۔اُن کی پریشان حالی کو دیکھ کر بنارس کے مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر نے انھیں بلا بھیجا۔اس وقت ان کی عمر چھہتّر سال تھی۔ بنارس میں سرؔور نے گیارہ برس قیام کیا۔پریشانیوں نے ساتھ پھر بھی نہ چھوڑا۔بالآخر 1286ھ بمطابق 1869 میں تمام پریشانیوں سے آزاد ہوگئے اور بنارس ہی میں دفن کیے گئے۔

10.4 ’باغ وبہار‘اور’فسانۂ عجائب‘ کا اسلوب

10.4.1 ’باغ وبہار‘ کا اسلوب:

’’باغ وبہار‘‘ کے منظر عام پر آنے کے بعد اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی جو آج بھی برقرار ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میر امّن نے اسے اپنی’’مادری زبان‘‘میں تحریر کیا اور ان کی مادری زبان وہ زبان تھی جو دہلی کی جامع مسجد کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔سچ یہ ہے کہ دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی زبان ہی اصل اردو تھی اور اس وقت ہندوستان پر آہستہ آہستہ قابض ہونے والی قوم یعنی انگریز مرکز کی اس زبان کو سیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔جہاں اہل زبان کو محض اس لیے رکھا گیا کہ وہ انگریزوں کے لیے ہندوستان میں مقبول کتابوں کو بزبان ہندوی اس انداز سے لکھیں کہ جن سے انگریز نہ صرف زبان سیکھ سکیں بلکہ یہاں کی تہذیب ومعاشرت سے بھی واقف ہوجائیں،اسی لیے میر امّن کو حکم ملا تھا:

> ’’اس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں،جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان،عورت مرد،لڑکے بالے،خاص وعام آپس میں بولتے چالتے ہیں،ترجمہ کرو،موافق حکم حضور کے،میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا،جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔‘‘

میر امّن نے حکم کے موافق کام انجام دیا جب کہ اس عہد میں نثر کا یہ اسلوب رائج نہیں تھا۔ ابتدائی دور ہونے کے سبب نثر پر فارسیت غالب تھی جس کی مثال ''نوطرز مرصّع'' کی شکل میں نظر آتی ہے، لیکن ''باغ و بہار'' ایک ضرورت کے تحت لکھی گئی، اس لیے اس میں دانستہ طور پر سلیس اور سادہ زبان کا استعمال کیا گیا۔ ''باغ و بہار'' میں وجہ تالیف یوں بیان کی گئی ہے:

> ''صاحبان ذی شان کو شوق ہوا کہ اردو زبان سے واقف ہو کر، ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں، اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال، بموجب فرمائش کے تالیف ہوئی۔''

میر امّن سے اردو نثر کا ایک نیا اسلوب شروع ہوتا ہے۔ ان سے قبل ''نوطرز مرصّع'' کو نثر کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ ''باغ و بہار'' کی اشاعت کے بعد اردو نثر عوام کے قریب آئی یا عوامی لگنے لگی۔ خود میر امّن ''باغ و بہار'' کی زبان کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو کی، ہندو مسلمان، مرد عورت اور آپس میں بولی جانے والی زبان بتاتے ہیں۔ بول چال اور تحریر کی زبان الگ الگ ہوتی ہے۔ بول چال میں عام فہم اور چھوٹے چھوٹے فی البدیہہ جملے استعمال کیے جاتے ہیں اور تحریر میں الفاظ کی نشست و برخاست کو ذہن میں ترتیب دے کر قلمبند کیا جاتا ہے۔ ''باغ و بہار'' کی زبان تحریری معلوم ہی نہیں ہوتی، اس میں منہ سے نکلے ہوئے بے ترتیب الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں قصہ بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے میر امّن مجمع کے روبرو قصہ سنا رہے ہیں اور کوئی کاتب اِسے لکھتا جا رہا ہے۔ میر امّن کی نثر کی یہی خوبی اُسے زندہ جاوید کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے ان کی نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''انھوں نے اپنی کتاب آسان اور بامحاورہ زبان میں اس وقت لکھی جب کہ فارسی اور عربی الفاظ کی شدت، قافیہ پیمائی، رنگین بیانی ہی کو قابلیت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ سلیس نگار کو کم علم جان کر کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ امّن نے روزمرہ اور محاورے کی نظر فریب کیاریوں کے سامنے عربیت کی سنگلاخ زمین کو ہیچ جانا...... باغ و بہار ان چند کتابوں میں سے ہے جن کی زبان اور طرز بیان ان کے نفس مضمون سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ ایک اسلوب کی نمائندہ ہے، حالانکہ اس کی کوئی تقلید نہ کر سکا پھر بھی باغ و بہار کے باغ پر ہمیشہ بہار رہی ہے اور رہے گی۔''

میر امّن نے اردو کو ایک نیا اسلوبِ نثر دیا، انھوں نے تقریری زبان کو تحریری شکل عطا کی۔ ان کے پاس عوام و خواص میں بولی جانے والی زبان کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ ''باغ و بہار'' میں استعمال کیے جو دہلی اور اُس کے آس پاس بولے جاتے ہوں گے، لیکن کسی کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ بول چال میں بعض ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں جن کی کوئی کتابی سند نہیں ملتی۔ میر امّن کی پوری کوشش رہی ہے کہ عوام کے بیچ مستعمل زبان اور محاورے ہی ''باغ و بہار'' کے بیان میں بیان کیے جائیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ''میں نے بھی اُسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔'' میر امّن کا یہی انداز اُن کی خصوصیت بن گیا۔ یہ اسلوب ان کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ انتہائی درجہ کی سادگی اور عوامیت کبھی کبھی عامیانہ پن پر آ جاتی ہے اور اُس فن پارے کی ادبیت پر اثر انداز ہوتی ہے، لیکن میر امّن سادگی، سلاست اور روزمرّہ کے استعمال کے ساتھ ساتھ ''باغ و بہار'' کی ادبیت کو بھی قائم رکھتے ہیں۔ وہ فارسی الفاظ، تراکیب، تشبیہات اور استعارات کا بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن اس انداز سے کہ وہ اُن کے مخصوص اسلوب کو زیر بار نہ

کرے۔ اُن کا اسلوب کہیں بھی ''فسانۂ عجائب'' کے اسلوب سے میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہی میرامّن کی انفرادیت ہے، وہ اپنی انفرادیت کو ابتدا تا آخر برقرار رکھتے ہیں۔ میرامّن کا قصہ کہیں سے بھی پڑھ لیجیے ان کے اسلوب کی سادگی اور سلاست ہر جگہ یکساں نظر آتی ہے۔ ان کی زبان کی لطافت اور حلاوت پڑھنے والے کے دل کو چھوتی چلی جاتی ہے۔ میرامن کے بیان میں اس قدر روانی ہے کہ کہیں رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ قصہ خود بخود آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میرامن کو ہر طبقہ کی زبان اور لہجہ سے اچھی واقفیت تھی۔ وہ کردار کے لحاظ سے زبان کا استعمال کرتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کی گفتگو کا انداز ہر جگہ مختلف نظر آتا ہے۔ ''باغ و بہار'' میں جگہ جگہ محاورے اور کہاوتیں نظر آتی ہیں۔ بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں، بقول ان کے کہ دلّی کے رہنے والے ہیں اور ان کی زبان ٹھیٹ دلّی کی زبان ہے۔

10.4.2 'فسانۂ عجائب' کا اسلوب:

''فسانۂ عجائب'' کا امتیاز اس کے اسلوب اور معاشرت کے بیان ہی میں مضمر ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کا طرز بیان ''نوطرز مرصّع'' سے مختلف ہے۔ ''نوطرز مرصّع'' کے انداز میں ابتدا تا آخر تقریباً یکسانیت ہے، یعنی دقیق الفاظ، نامانوس تراکیب، تشبیہات اور استعارات کی بہتات ہر جگہ موجود ہے، اس کے برعکس ''فسانۂ عجائب'' میں عام طور پر ہر باب کے ابتدائی پیراگراف میں سرؔور مقفّیٰ، مرصّع، مسجّع نثر اور فارسی تراکیب کا استعمال ضرور کرتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر میں سادگی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ وہ زیادہ دور اور دیر تک مصنوعی نثر نہیں لکھتے۔ اسے قصہ گو کی خوبی بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ قصے کی ابتدا پُرشکوہ انداز میں کر کے نہ صرف سامعین کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے، بلکہ اپنی علمیت اور لیاقت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے، اس کے بعد وہ قصے کو عام فہم زبان دے دیتا ہے تاکہ قصّے میں سامعین کی دلچسپی برقرار رہے وہ زبان کے پیچ و خم میں نہ الجھیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین تو ''فسانۂ عجائب'' کی عظمت کا راز ہی اس کے مرصّع اسلوب میں بتاتے ہیں۔ سرور نے بار بار اپنی تحریر کو پرکھا اور سنوارا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی نثر سرؔور کے نزدیک سہل ممتنع ہے۔ بلاشبہ اس عہد میں سہل ممتنع کی یہی صورت رہی ہوگی۔ سرؔور لکھتے ہیں:

> ''نظر ثانی میں جو لفظ دقّت طلب غیر مستعمل عربی، فارسی کا مشکل تھا، اپنے نزدیک اُسے دور کیا اور کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا، رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا۔''

''فسانۂ عجائب'' کا اسلوب اپنے اندر ادبیت لیے ہوئے ہے۔ سرؔور بالکل عامیانہ سطح پر نہیں اترتے، کیونکہ ان کے قارئین کا تعلق سطحی لوگوں سے نہیں ہے، اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ ''فسانۂ عجائب'' اس طبقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ سرؔور داستان کی عبارت کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے بار بار اسے سنوارتے ہیں۔ ان کی متعدد بار کی اصلاح سے ''فسانۂ عجائب'' میں روانی اور سلاست پیدا ہو جاتی ہے، کہیں پیچیدگی اور ابہام نظر نہیں آتا۔ ''فسانۂ عجائب'' کے اسلوب پر ڈاکٹر مسیح الزماں کا یہ تبصرہ بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ''سرؔور کا کمال اور ان کے فن کی کامیابی یہ ہے کہ مروّجہ پابندیوں کے باوجود ان کی عبارت میں ایسی بے ساختگی اور شگفتگی باقی ہے کہ عبارت میں الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک اپنے رنگ کی کتابوں میں ''فسانۂ عجائب'' کو جو امتیاز حاصل ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی عبارت میں تصنع اور تکلف ہونے کے باوجود ایک ایسی شیرینی اور دلکشی ہے کہ آدمی کو اس کے پڑھنے میں الجھن نہیں ہوتی اور زیادہ تر جگھوں پہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص کوشش سے لکھی گئی ہے۔''

''باغ و بہار'' دراصل ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو کے لہجہ میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں کہیں کہیں بہت عامیانہ پن آ گیا ہے، بلکہ ''باغ و بہار'' میں شاہی خواتین بھی کبھی کبھی انتہائی عامیانہ زبان استعمال کرتی ہیں، جو ان کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتی۔ واقعی وہ ''دلّی کے روڑے'' معلوم ہوتے ہیں، جبکہ ''فسانۂ عجائب'' کی زبان تحریری زبان ہے اور جس کی نوک پلک بار بار درست ہوتی ہے، اسی لیے اس کے لہجہ میں ایک خاص رکھ رکھاؤ، نفاست اور شائستگی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین تو ''فسانۂ عجائب'' کی عظمت کا راز ہی اس کے مرصّع اسلوب میں بتاتے ہیں۔ عام طور پر داستان کے نقادوں نے ''فسانۂ عجائب'' کو سرسری طور سے لیا ہے اور ''باغ و بہار'' کی موجودگی میں اس کو فارسی و عربی آمیز غیر مانوس نثر کہہ کر گزر گئے ہیں۔ اس کی ''عظمت کے راز'' کو خامی بتا کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ ادب کی ہر عہد میں دو سطح ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو محض اور محض تفنّنِ طبع کے لیے لکھا جاتا ہے، جس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ اس طرح کے ادب کی زبان و بیان کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ آج بھی اس طرح کے ہزاروں ناول لکھے جاتے ہیں۔ ادب کی دوسری سطح معیاری ادب کی ہوتی ہے، جس میں مصنف کا مخصوص اسلوب اور فکر شامل ہوتی ہے۔ یہ ابلی ہوئی سبزی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس کی تخلیق میں تخلیقی کرب شامل ہوتا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی تخلیق ایسے ہی تخلیقی کرب کا نتیجہ ہے۔ مصنف نے بار بار اپنی تحریر کو پرکھا اور سنوارا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی نثر سرورؔ کے نزدیک سہلِ ممتنع ہے۔ بلاشبہ اس عہد میں سہلِ ممتنع کی یہی صورت رہی ہوگی۔

10.5 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا تقابلی مطالعہ

داستان مختلف واقعات یا قصوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ داستان گو اپنی قوتِ متخیّلہ کے ذریعہ چھوٹے سے قصے کو طویل اور دلچسپ بنا کر اس میں ایسا حسن پیدا کرتا ہے کہ سامعین کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے داستان کو اسی لیے کہانی کی طویل اور پیچیدہ صنف کہا ہے کہ بہت سے قصوں کو جوڑ کر ایک داستان بنائی جاتی ہے۔ دراصل داستان ایسے دور کی پیداوار ہے جب لوگوں کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی، غمِ روزگار اور فکرِ آخرت سے آزاد تھے۔ داستان تفریح و تسکین کا ذریعہ تھی، انسان اپنی جمال پرست فطرت کی آسودگی کے لیے داستان گوئی کا سہارا لیتا تھا۔ داستان کی جمالیاتی فضا سننے والوں کو فرحت بخشتی تھی، وہ اس داستانوی ماحول میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا خواہاں رہتا تھا، جس کے سبب داستان گو داستان کو طول دینے کی کوشش کرتا تھا۔ داستان کی طوالت کسی کو ناگوار نہیں گزرتی تھی، بلکہ اشتیاق بڑھاتی تھی، کیونکہ داستان گو اپنی قوتِ متخیّلہ سے داستان میں نئے نئے مضامین پیدا کرتا تھا۔ داستان کے حسن کا انحصار ہی داستان گو کی قوتِ متخیّلہ پر ہے۔ داستان گو طوالت کے لیے داستان میں ضمنی قصوں کو اس فنکاری کے ساتھ شامل کرتا ہے کہ وہ بنیادی قصہ کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی طوالت گراں نہیں گزرتی۔

داستان دراصل بیان کا فن ہے۔ بیان میں وسعت اور خیال کی پرواز کی جو گنجائش ہے، تحریر میں وہ محدود ہو جاتی ہے۔ اردو کی بیشتر داستانیں پہلے کہیں نہ کہیں بیان کی گئیں، بعد میں ضبطِ تحریر میں آئیں۔ کچھ وقت پہلے تک شہروں، قصبوں اور دیہات میں داستان گوئی یا قصہ گوئی کا عام رواج تھا۔ داستانیں اور مثنویاں محفلوں میں سنائی اور گائی جاتی تھیں۔ ''بوستانِ خیال'' جیسی طویل داستان بھی پہلے میر تقی خیال نے زبانی بیان کی۔ ''فسانۂ عجائب'' بھی سرورؔ نے دوستوں کے درمیان شروع کی۔ بیشتر داستانوں کا خمیر زبانی قصوں سے اٹھایا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی حکایتوں یا روایتوں کے بیان ہی سے قصہ گوئی یا داستان گوئی کا جنم ہوا۔ قصہ چہار درویش یعنی باغ و بہار بھی پہلے زبانی بیان کی گئی۔ داستان گو ایک خاص طے شدہ آغاز و انجام کو سوچ کر داستان شروع کر دیتا ہے،

لیکن درمیان میں قصّے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور داستان ایک وسیع دائرے میں پھیل جاتی ہے۔ ایک کہانی میں کبھی کبھی سیکڑوں قصّے شامل ہو جاتے ہیں، لیکن قصہ کا تعلق داستان کی بنیادی کہانی سے ضرور ہوتا ہے۔

ہر داستان ایک ہی انداز سے شروع ہوتی ہے۔ ہر داستان کا پہلا کردار کسی ملک یا شہر کا بادشاہ ہوتا ہے جو عام طور پر داستان کی ابتدا اور اختتام پر ہی نظر آتا ہے، اس لیے کہ وہ مرکزی کردار یا داستان کا ہیرو نہیں ہوتا۔ داستانوں میں اس کی اولاد یعنی شاہزادے مرکزی کردار ہوتے ہیں۔ جن بادشاہوں سے داستانوں کا آغاز ہوتا ہے وہ سبھی عدل و انصاف میں نوشیرواں اور سخاوت میں حاتم بتائے جاتے ہیں۔ رعایا ان کے عہد میں انتہائی خوشگوار زندگی بسر کرتی ہے۔ سبھی داستان کے آغاز اور ان کے کرداروں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔

''اب آغاز قصہ کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ (جس کو اب استنبول کہتے ہیں) کا پایۂ تخت تھا۔''

''گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن، یعنی محرّرانِ رنگین تحریر، و مورخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان با کرشمۂ سحر سازی و لطیفہ ہائے حیرت پرداز گرم عنان و جولاں یوں کیا ہے کہ سرزمین ختن میں ایک شہر تھا مینوسواد، بہشت نژاد، پسند خاطر محبوبانِ جہاں، قابلِ بود و باش خوبانِ زماں، شمیم صفت، اس کی معطر کن دماغ جاں مسکن التہاب قلب واقع خفقاں، زمین اس کی رشکِ چرخ بریں، رفعت و شان چشمک زن بلندی فلک ہفتمیں، گلی کوچہ خجلت دہ گلشن۔ آبادی گلزار، بسان تختہ چمن، بازار ہر ایک بے آزار مصفّا ہموار، دوکانیں نفیس، مکان نازک پائدار، خلق خدا با خاطر شاد، اسے فسحت آباد کہتے تھے۔''

ہر تذکرہ نگار اور ناقد نے ''باغ و بہار'' کا ذکر کرتے وقت اس کے طرز بیان کی سادگی، دلکشی، فصاحت اور بلاغت ہی پر گفتگو کی۔ میر امّن سادگی، سلاست اور روزمرّہ کے استعمال کے ساتھ ساتھ ''باغ و بہار'' کی ادبیت کو بھی قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا اسلوب کہیں بھی ''فسانۂ عجائب'' کے اسلوب سے میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہی میر امّن کی انفرادیت ہے، وہ اپنی انفرادیت کو ابتدا تا آخر برقرار رکھتے ہیں۔ میر امّن کا انداز یہ ہے:

''یہ دل میں کہہ کر، چاہتا ہوں کہ اپنے تئیں گراؤں بلکہ پانو بھی اُٹھ چکے تھے کہ کسو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں ہوش آ گیا، دیکھتا ہوں تو ایک سوار سبز پوش، منہ پر نقاب ڈالے، مجھے فرماتا ہے کہ کیوں تو اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے۔ خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے۔ جب تلک سانس ہے، تب تلک آس ہے۔ اب تھوڑے دنوں میں روم کے ملک میں، تین درویش تجھ سار کے، ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے، تجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے، اُس کو بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے۔ جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا، تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے، بخوبی حاصل ہوگی۔''

میر امّن کا قصہ کہیں سے بھی پڑھ لیجیے ان کے اسلوب کی سادگی اور سلاست ہر جگہ یکساں نظر آتی ہے۔ ان کی زبان کی لطافت اور حلاوت پڑھنے والے کے دل کو چھوتی چلی جاتی ہے۔ میر امن کے بیان میں اس قدر روانی ہے کہ کہیں رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ قصہ خود بخود آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میر امن کو ہر طبقہ کی زبان اور لہجہ سے اچھی واقفیت تھی۔ وہ کردار کے لحاظ سے زبان کا استعمال کرتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کی گفتگو کا انداز ہر جگہ مختلف نظر آتا ہے:

''سوداگر بچہ (یعنی بیٹی وزیر کی) اپنی ماں کے پانو پر جا گری اور روئی، اور بولی کہ میں تمہاری جائی ہوں، سنتے ہی وزیر کی بیگم گالیاں دینے لگی کہ اے تتری! تو بڑی شتا ہو نکلی، اپنا منہ تو نے کالا کیا اور خاندان کو رسوا کیا۔ ہم تو تیری جان کو رو پیٹ کر، صبر کر کے تجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، جا دفع ہو''

''فسانۂ عجائب'' کے طرز بیان نے انیسویں صدی کی نثر کو بہت متاثر کیا۔ ''باغ و بہار'' کی سلاست اور سادگی کی ڈگر سے ہٹ کر لکھی جانے کے باوجود ''فسانۂ عجائب'' کی نثر اپنے عہد میں بہت مقبول ہوئی۔ اسی مقبولیت کے سبب بار بار اس کی طباعت عمل میں آئی۔ ''باغ و بہار'' کو اپنی سادگی اور سلاست کی وجہ سے قبولیت عام نصیب ہوئی تھی اور اس کے جواب میں لکھی گئی ''فسانۂ عجائب'' کی تخلیق کے وقت تک لکھنؤ کے دربار کی آرائش و زیبائش اور پُر تکلفانہ ماحول ختم نہیں ہوا تھا۔ اس پُر تکلفی کے اثرات براہ راست شعر و ادب پر بھی پڑ رہے تھے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی پُر تکلف نثر اسی لیے اس دور میں پسند کی گئی۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''فسانۂ عجائب ایسے طرز میں لکھی گئی جو اس زمانے اور اس خاص ماحول کا پسندیدہ طرز ہے جس میں وہ اختیار کیا گیا ہے۔ اور طرزِ خاص میں سروؔر کی شخصیت کا رنگ ہر جگہ چھایا ہوا ہے اور اس نے بہت سے عیبوں کے باوجود اس میں بعض امتیاز پیدا کیے ہیں۔''

''فسانۂ عجائب'' کا امتیاز اس کے اسلوب اور معاشرت کے بیان ہی میں مضمر ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کا طرز بیان ''نوطرز مرصّع'' سے مختلف ہے ''نوطرز مرصّع'' کے انداز میں ابتدا تا آخر تقریباً یکسانیت ہے، یعنی دقیق الفاظ، نامانوس تراکیب، تشبیہات اور استعارات کی بہتات ہر جگہ موجود ہے، اس کے برعکس ''فسانۂ عجائب'' میں عام طور پر ہر باب کے ابتدائی پیراگراف میں سروؔر مقفّیٰ، مرصّع، مسجّع نثر اور فارسی تراکیب کا استعمال ضرور کرتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر میں سادگی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ وہ زیادہ دور اور دیر تک مصنوعی نثر نہیں لکھتے۔ اسے قصہ گو کی خوبی بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قصے کی ابتدا پُر شکوہ انداز میں کر کے نہ صرف سامعین کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے، بلکہ اپنی علمیت اور لیاقت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے، اس کے بعد وہ قصے کو عام فہم زبان دے دیتا ہے تاکہ قصے میں سامعین کی دلچسپی برقرار رہے وہ زبان کے پیچ و خم میں نہ الجھیں۔

''فسانۂ عجائب'' کے بارے میں عام رائے بنی ہوئی ہے کہ اس کی زبان مشکل ہے اور اس پر فارسیت کا غلبہ ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ بعض مقامات پر تو ضرور ''فسانۂ عجائب'' میں ''نوطرز مرصّع'' کے اثرات دکھائی دیتے ہیں، لیکن اکثر جگہوں پر ''باغ و بہار'' کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ ماحول کے تکلّفات کا ہے جس کے لیے لکھنؤ آج بھی مشہور ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ بیان کہ ''عربی فارسی کی افراط، مقفّیٰ و مسجّع فقرے، استعاروں کی نکتہ سنجی، ایہام کی موشگافی، مبالغے کا زور اور اطناب بے جا فسانۂ عجائب کے عناصر ترکیبی ہیں۔'' کچھ زیادہ ہی ناقدانہ ہے، جبکہ ''فسانۂ عجائب'' کی عبارت کا بیشتر حصہ ایسا نہیں ہے۔ قصے میں شاہزادے اور شاہزادیوں کی زبان تو بالکل سادہ اور روزمرہ ہے۔ جان عالم جو مرکزی کردار ہے۔ تمام شان و شوکت اس کے ارد گرد ہے، جب بات کرتا ہے تو عام آدمی لگتا ہے، مثلاً:

''شاہزادے نے مسکرا کر کہا ''مصیبت خیلا تجھ پر پڑی ہوگی۔ معلوم ہوا یہاں آفت زدے آتے ہیں، کہو تو تم سب کی کیا کمبختی، ایاموں کی گردش نصیبوں کی سختی ہے، جو چڑیلوں کی طرح ناکام سرشام پھرتی ہو۔''

شاہزادیوں کی گفتگو تو ''باغ و بہار'' کے نسوانی کرداروں سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ بلکہ مہر نگار جان عالم سے کہتی ہے:

''تم کوئی زور چیز ہو، یکہ وتنہا، ٹٹو نہ گھوڑا، گھڑی نہ بقچہ، ننگا لچا، وہی مثل ہے۔ رہے جھونپڑے میں، خواب دیکھے محلوں کا، ہر بات میں ٹھنڈی گرمیاں کرتے ہو، جو یہی خوشی ہے تو لو۔''

اور شاہزادی انجمن آرا جو داستان کی ہیروئن ہے، اس انداز سے بات کرتی ہے:

''میری قسمت کمبخت بری ہے، ایک مصیبت سے چھڑا، دوسری آفت میں پھنسایا، ہر دم کے طعنے، اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا مجھے قید سے چھڑایا۔ خدا جانے وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اپنے تئیں شاہزادہ بنایا ہے۔ میں آپ کی لونڈی ہوں، بہر صورت فرمانبردار، اگر کنوئیں میں جھونک دو، چاہ سے گر پڑوں، اُف نہ کروں۔''

''فسانۂ عجائب'' کا اسلوب اپنے اندر ادبیت لیے ہوئے ہے۔ سرؔور بالکل عامیانہ سطح پر نہیں اترتے، کیونکہ ان کے قارئین کا تعلق سطحی لوگوں سے نہیں ہے، اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ ''فسانۂ عجائب'' اس طبقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ''باغ و بہار'' دراصل ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو کے لہجہ میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں کہیں کہیں بہت عامیانہ پن آ گیا ہے، بلکہ ''باغ و بہار'' میں شاہی خواتین بھی کبھی کبھی انتہائی عامیانہ زبان استعمال کرتی ہیں، جو ان کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتی۔ واقعی وہ ''دلّی کے روڑے'' معلوم ہوتے ہیں، جبکہ ''فسانۂ عجائب'' کی زبان تحریری زبان ہے اور جس کی نوکِ پلک بار بار درست ہوتی ہے، اسی لیے اس کے لہجہ میں ایک خاص رکھ رکھاؤ، نفاست اور شائستگی نظر آتی ہے۔ عام طور پر داستان کے نقادوں نے ''فسانۂ عجائب'' کو سرسری طور سے لیا ہے اور ''باغ و بہار'' کی موجودگی میں اس کو فارسی و عربی آمیز غیر مانوس نثر کہہ کر گزر گئے ہیں۔ اس کی ''عظمت کے راز'' کو خامی بتا کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ ادب کی ہر عہد میں دو سطح ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو محض اور محض تفنّنِ طبع کے لیے لکھا جاتا ہے، جس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ اس طرح کے ادب کی زبان و بیان کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ آج بھی اس طرح کے ہزاروں ناول لکھے جاتے ہیں۔ ادب کی دوسری سطح معیاری ادب کی ہوتی ہے، جس میں مصنف کا مخصوص اسلوب اور فکر شامل ہوتی ہے۔ یہ ابلی ہوئی سبزی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس کی تخلیق میں تخلیقی کرب شامل ہوتا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی تخلیق ایسے ہی تخلیقی کرب کا نتیجہ ہے۔ مصنف نے بار بار اپنی تحریر کو پرکھا اور سنوارا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی نثر سرؔور کے نزدیک سہلِ ممتنع ہے۔ بلاشبہ اس عہد میں سہلِ ممتنع کی یہی صورت رہی ہوگی۔

''باغ و بہار'' اور ''فسانۂ عجائب'' میں دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ میر امّن کی وابستگی دلّی کی زمین سے تھی۔ وہ عظیم آباد اور کلکتہ میں بھی اپنی زمین سے وابستہ رہے۔ ان کے بیان میں دلّی کے لال قلعہ کا شاہانہ ساز و سامان، شاہزادیوں کے باغات، یہاں کی عالیشان حویلیاں اور چاندنی چوک بھی موجود ہے۔ ''نوطرزِ مرصّع'' کی طرح ''باغ و بہار'' میں بھی چیزوں اور کھانوں کے نام کی ایک طویل فہرست ہے۔ میر امّن کسی منظر کے بیان کے وقت ہر چیز پر نظر رکھتے ہیں، ان کے بیان میں دلّی کے وزراء اور امراء کی حویلیوں کی آرائش و زیبائش نظر آتی ہے۔ مثلاً:

''اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے، گلہارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یساول عصے بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا، لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلّف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ پاندان، گلاب پاش، عطر دان، پیک دان، چنگیرین، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں میں رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور

گلابیاں، رنگ بہ رنگ کی چُنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز اَبرک کی ٹٹّیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔''

''فسانۂ عجائب'' میں سرؔور کی لکھنؤ سے محبت اور وابستگی نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کی پوری تصویر تو سرؔور نے قصے کے آغاز سے قبل ہی ایک باب کی شکل میں پیش کردی ہے۔ قصے میں جہاں کہیں بھی کسی شہر کا ذکر آیا ہے اس بیان میں بھی لکھنؤ ہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے زرنگار کا بیان:

''دروازے سے آگے بڑھا، شہر دیکھا، قطع دار، ہموار، قرینے سے بازار، کرسی ہر دکان کی کمر برابر، مکان ایک سے ایک بہتر و برتر، بیچ میں نہر، جابجا فوارے، عمارات شہر پناہ کے میل کے، جواہر نگار سانچے کے ڈھلے، ہاتھ کا کام معلوم نہ ہوتا تھا، نہ کہیں بلندی نہ پستی، ہموار بسی ہوئی بستی، ایک کا جواب دوسری طرف۔ اِدھر بزاز تو اُدھر بھی صراف کے مقابل صراف، بازار کا صحن، نفیس شفاف، جوہری کے روبرو جوہری، زرو جواہر کا ہر سمت ڈھیر، نقد و جنس سے ہر شخص سیر، ...... حلوائی، نانبائی، کنجڑے قصائی، سقّوں کے کٹوروں کی جھنکار، میوہ فروشوں کی پکار، دلالوں کی بول چال، جہاں کا اسباب و مال، نہر کی کیفیت جدا، قدِ آدم آب مصفّا، فواروں سے کیوڑہ گلاب اچھلتا، بازار مہک رہا، ہر طرف دھوم دھام خلقت کا اژدہام۔''

10.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں

- آپ 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کی خصوصیات سے واقف ہوئے۔
- آپ میر امن اور رجب علی بیگ سرور سے متعارف ہوئے۔
- آپ 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا اسالیب سے متعارف ہوئے۔
- آپ نے 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ کیا۔
- آپ 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' میں جس معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اس سے بھی متعارف ہوئے۔

10.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1. 'باغ و بہار' کب اور کہاں لکھی گئی؟
2. میر امن کہاں کے رہنے والے تھے؟
3. 'باغ و بہار' میں کتنے درویشوں کے قصے ہیں؟
4. 'فسانۂ عجائب' کب اور کہاں لکھی گئی؟
5. رجب علی بیگ سرور کہاں دفن ہوئے؟

10.8 سوالات کے جوابات

1. 'باغ و بہار' 1803 عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں لکھی گئی۔

2. میرامن دہلی کے رہنے والے تھے۔

3. 'باغ و بہار' میں چار درویشوں کے قصے بیان ہوئے ہیں۔

4. 'فسانۂ عجائب' 1824 عیسوی میں کانپور میں لکھی گئی۔

5. رجب علی بیگ سرور بنارس میں دفن ہوئے۔

10.9 فرہنگ

جزئیات	تفصیل، جزوی کی جمع
جمالیات	خوبصورتی
قوت متخیلہ	خیال یا تخیل کی طاقت
مشاہدہ	دیکھنا
متروک	چھوڑا ہوا
طبیب حاذق	حکیم
منجم صادق	نجومی
لاشعور	جہاں عقل نہ پہنچ سکے

10.10 کتب برائے مطالعہ

اردو کی نثری داستانیں	گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۷ء
اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	ادارۂ فروغِ اردو، امین آباد، لکھنو
ہماری داستانیں	وقار عظیم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان، نئی دہلی
داستان کی جمالیات (اردو کی نثری داستانیں)	ابن کنول	M.R. Publications New Delhi 2020
اردو داستان: تحقیق و تنقید	قمر الہدی فریدی	علی گڑھ
باغ و بہار (مرتبہ)	ابن کنول	
فسانۂ عجائب (مرتبہ)	ابن کنول	

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 11 ’باغ و بہار‘ میں ہندوستانی معاشرت

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 ’باغ و بہار‘ میں ہندوستانی معاشرت

11.3.1 داستانوں میں معاشرت کی عکاسی

11.3.2 ’باغ و بہار‘ میں ہندوستانی معاشرت

11.4 آپ نے کیا سیکھا

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 سوالوں کے جوابات

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- داستانوں میں معاشرت کی عکاسی سے واقف ہوں گے۔
- ’باغ و بہار‘ میں ہندوستانی معاشرت کی عکاسی سے واقف ہوں گے۔
- ’باغ و بہار‘ میں مناظر فطرت کے بیان کا جائزہ لیں گے۔
- میر امن کی جزئیات نگاری مطالعہ کریں گے۔

11.2 تمہید

اردو میں افسانوی نثر کی ابتدا داستانوں سے ہوتی ہے، داستانوں کی عہد حاضر میں اہمیت کی ایک بڑی وجہ اس میں اپنے عہد کی معاشرت کا بیان ہے۔ ہر داستان اپنے زمانے کی تہذیب کی عکاس ہوتی ہے۔ اور ہر داستان گو کی تہذیبی جزئیات پر گہری نظر ہوتی ہے۔ جس قدر مفصل تہذیب کا عکس داستانوں میں نظر آتا ہے، کسی اور صنفِ ادب یا تاریخ میں دکھائی نہیں دیتا۔ داستان کی جمالیات کا ایک اہم پہلو معاشرت کے بیان میں پوشیدہ ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

’’یہ ہمارے تمدن کی ابتدائی تصویریں ہیں۔ انھیں کے بل بوتے پر اُس دور کے تمدنی خاکے مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ اس دور کی تاریخ اور کوئی تذکرہ اس سے زیادہ سچی اور واضح تصویر پیش نہیں کرسکتا۔‘‘

11.3 'باغ و بہار' میں ہندوستانی معاشرت

11.3.1 داستانوں میں معاشرت کی عکاسی:

داستان اگر چہ ایک عشقیہ قصہ کا بیان ہے، لیکن اس بیان کے ساتھ پورا ایک معاشرہ، ایک تہذیب گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ داستان گو کے اطراف کی زندگی لاشعوری یا نیم شعوری طور پر داستان میں خود بخود شامل ہو جاتی ہے۔ داستان کا انحصار داستان گو کی قوت متخیّلہ پر ہوتا ہے اور قوت متخیّلہ مشاہدے اور مطالعہ پر مبنی ہے۔ کسی بھی فنکار کی تمام تخلیقات کا دار و مدار اس کے تخیل کی وسعت پر ہے۔ اصناف ادب میں داستان وہ بحر ذخّار ہے جو پوری کائنات کو اپنے اندر سمونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اردو کی داستانوں میں کہیں لکھنؤ اور کہیں دہلی کی معاشرت دکھائی دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''داستان امیر حمزہ میں سے ساحری اور عیاری نکال لیجئے تو باقی لکھنؤ کی معاشرت بچے گی۔ یہ داستان اودھ کی تہذیب ارژنگ ہے۔'' داستانوں کا شہر چاہے ایران ہو، دمشق، قسطنطنیہ ہو یا ختن و روم یا چین۔ اس میں ہر جگہ ہندوستان نظر آئے گا۔ ڈاکٹر راہی معصوم طلسم ہوش ربا کا تہذیبی و سماجی مطالعہ کرتے وقت کہتے ہیں:

> ''طلسم ہوش ربا ایک تہذیبی دستاویز ہے، اس لیے قابل احترام ہے، اس کے ہر ہر لفظ میں لکھنؤ رچا بسا ہے اور لکھنؤ ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے اس میں سارے شمالی ہندوستان کی زمین سمائی ہے، اس میں بادشاہ کا تصور بھی خالص ہندوستانی ہے اور جادوگر بھی ہندوستانی ہیں۔''

داستان امیر حمزہ ہو یا بوستان خیال، باغ و بہار ہو یا فسانۂ عجائب یا کوئی اور داستان، سب میں وہ معاشرت نظر آتی ہے جو داستان گو کے چاروں طرف موجود ہے۔ کسی بھی ایک داستان سے اس کے عہد کی تہذیب و تمدن کی واضح تصویر بنائی جا سکتی ہے۔ صرف ایک داستان ہی فرد اور اس کی زندگی از ولادت تا وفات، اس کے اطراف کا معاشرہ، معاشرے کے رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے، آداب و اعتقادات وغیرہ کو بڑی وضاحت سے پیش کرتی ہے۔

11.3.2 'باغ و بہار' میں ہندوستانی معاشرت:

''باغ و بہار'' کی کہانی اس طرح ہے۔ ملک روم کا ایک بادشاہ ہے کہ نام جس کا آزاد بخت ہے۔ ''نوشیرواں کی سی عدالت ہے اور حاتم کی سی سخاوت''۔ اس کے وقت میں رعایا خوشحال ہے ''ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات شب رات'' ہے۔ بہت بڑی سلطنت ہے، ہر طرح کا عیش و آرام ہے بادشاہ کی عمر چالیس سال ہے، لیکن اولاد سے محروم ہے جو اس کے نام اور سلطنت کو قائم رکھے۔ مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں بادشاہ سب کچھ چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ سلطنت میں ابتری پھیل جاتی ہے، بغاوت سر اٹھاتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر اس کا عاقل وزیر بادشاہ کے پاس جاتا ہے، روتا پیٹتا ہے کہ سلطنت برباد ہو رہی ہے۔ باغی سر اُٹھا رہے۔ ''بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ ہر دم اور ہر ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر دعا مانگا کریں۔ اس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔'' لیکن سلطنت کے کام کاج پر بھی نظر رکھیں۔ رات عبادت میں گزاریں۔ وزیر کے مشورے پر بادشاہ آزاد بخت عمل کرتا ہے۔ ایک رات کو بھیس بدل کر قبرستان کی طرف سکون کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اندھیری رات ہے، تیز ہوائیں چل رہی ہیں کہ بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ کیا طلسم ہے جو آندھی میں چراغ جل رہا ہے۔ قریب جا کر دیکھتا ہے کہ چار فقیر کفنیاں پہنے، زانو پر سر دھرے، عالم بے ہوشی

میں خاموش بیٹھے ہیں۔ بادشاہ خاموشی سے ایک جانب چھپ کر بیٹھ جاتا ہے تا کہ ان کا احوال جان سکے۔ پھر یہ چار درویش رات گزارنے کے لیے اپنی اپنی سرگزشت شروع کرتے ہیں۔ پہلا درویش یمن کے ملک التجار خواجہ احمد کا بیٹا ہے۔ خواجہ احمد کے انتقال کے بعد باپ کی جمع کی ہوئی دولت سے عیش وعشرت کی زندگی گزارتا ہے۔ دولت کی چاہت میں اُس کے ''غنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹھے، خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے، اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی'' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں، جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے، تاب بھوک کی نہ لا سکا''۔ بالآخر یہ درویش اپنی بہن کے گھر جاتا ہے۔ بہن سماج میں بدنامی کے ڈر سے اُسے کچھ روپے دے کر ایک قافلہ کے ساتھ تجارت کے لیے بھیجتی ہے، لیکن یہ پھر عجیب حالات میں عشق میں پھنس جاتا ہے۔ وہاں بھی ناکامی ہوتی ہے، خودکشی کا ارادہ کرتا ہے کہ ایک نقاب پوش آکر اُسے روک لیتا ہے اور ملک روم جانے کے لیے کہتا ہے۔ اسی طرح دوسرا درویش اپنا احوال بیان کرتا ہے۔ دوسرا درویش فارس کا شاہزادہ ہے، وہ دربدر بھٹکتا ہے، آخر میں خودکشی کرنا چاہتا ہے کہ اُسے بھی نقاب پوش روک کر روم جانے کے لیے کہتا ہے۔

دوسرے درویش کا قصہ تمام ہونے تک رات گزر جاتی ہے، صبح ہوتی ہے۔ بادشاہ آزاد بخت اپنے محل میں واپس چلا جاتا ہے اور ان چاروں درویشوں کو اپنے دربار میں بلاتا ہے، ان کی خاطر تواضع کرتا ہے، وہ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ بادشاہ پہلے اپنا حال بیان کرتا ہے۔ آزاد بخت کے بیان میں خواجہ سگ پرست کی کہانی شامل ہے۔ آزاد بخت کے قصہ کے بعد بادشاہ کی فرمائش پر تیسرا درویش اپنا قصّہ سناتا ہے۔ تیسرا درویش عجم کا بادشاہ زادہ ہے۔ ایک دن شکار کے لیے جنگل میں جاتا ہے۔ ایک ہرن دیکھتا ہے جو زربفت کی جھول اور سونے کے گھونگھروؤں کا پٹّا گلے میں باندھے ہوئے ہے۔ شاہزادہ تنہا اُس کا پیچھا کرتا ہوا دور نکل جاتا ہے اور خود مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔ آخر میں تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے، پھر وہی نقاب پوش آکر روکتا ہے اور اس کی ہدایت پر روم آتا ہے۔

چوتھا درویش چین کا بادشاہ زادہ ہے۔ بادشاہ کا انتقال ہو جاتا ہے، بھتیجے کو بے دخل کر کے چچا سلطنت پر قابض ہو جاتا ہے۔ چچا شاہزادے کو قتل کرانے کا ارادہ کرتا ہے۔ شاہزادے کے والد کا ایک وفادار حبشی مبارک اُسے وہاں سے جنوں کے بادشاہ ملک صادق کے پاس لے جاتا ہے۔ شاہزادہ کا قصّہ پھر اتنا پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ نوبت خودکشی کو پہنچتی ہے۔ نقاب پوش پھر آتا ہے اور روک کر روم جانے کے لیے کہتا ہے۔ اِدھر چوتھے درویش کا قصّہ ختم ہوتا ہے اُدھر محل سے خبر آتی ہے کہ ''اس وقت شاہ زادہ پیدا ہوا کہ آفتاب و ماہتاب اس کے حسن کے روبرو شرمندہ ہیں۔'' آزاد بخت بہت خوش ہوتا ہے، لیکن نومولود شاہزادہ کے ساتھ بھی ایک قصّہ جڑا ہوا ہے، یعنی جب اُسے نہلا دُھلا کر لاتے ہیں تو اُسے کوئی اٹھا کر لے جاتا ہے اور پھر دے جاتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ بادشاہ بڑا پریشان ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ جنوں کے بادشاہ ملک شہبال کے یہاں جاتا ہے۔ آزاد بخت چاروں درویشوں کے ساتھ شہبال سے ملاقات کرتا ہے، پھر شہبال کی مدد سے ان چاروں درویشوں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ قصّہ یہاں تمام ہوتا ہے اور داستان گو حسب روایت کہتا ہے: ''جس طرح یہ چاروں درویش اور پانچواں بادشاہ آزاد بخت اپنی مراد کو پہنچے، اسی طرح ہر ایک نامراد کا مقصد دلی اپنے کرم و فضل سے بَر لا، بہ طفیل پنجتن پاک، دوازدہ امام، چہاردہ معصوم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے آمین یا الٰہ العالمین۔

''باغ و بہار'' کی اہم خصوصیت اس میں اپنے عہد کی معاشرت کا بیان ہے۔ داستان کیا ہے گویا اٹھارہویں صدی عیسوی کی دلّی کی تہذیب کی عکاس ہے، پورے قصے میں ہندوستان کی زندگی کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

میرامن دلّی کے رہنے والے تھے خود کو دلّی کا روڑا کہتے تھے اس لئے ان کے بیان میں دلّی، دلّی کے وزراء و امراء کی حویلیوں کی آرائش و زیبائش دکھائی دیتی ہے۔ ''باغ و بہار'' یوں تو ایک مختصر داستان ہے لیکن اس اختصار میں بھی میرامن نے جزئیات کے بیان کا لحاظ رکھا ہے۔ دیگر داستانوں کی طرح ''باغ و بہار'' میں بھی ولادت سے وفات تک کی رسومات کا ذکر مل جاتا ہے۔ معاشرت کی تفصیل بھی ''باغ و بہار'' کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ میرامن کے لاشعور میں بسی دلّی کی معاشرت خود بخود ''باغ و بہار'' میں شامل ہوگئی ہے۔ روم، چین، دمشق یا بصرے کا نام لے کر میرامن نے دلّی کی تہذیب کو پیش کیا ہے۔ میرامن نے ''باغ و بہار'' میں اپنے عہد کی تہذیب کو پیش کر کے فورٹ ولیم کالج کے طالب علموں کو ہندوستانی تہذیب سے روشناس کرایا۔ میرامن کیونکہ ایک ایسی کتاب تیار کر رہے تھے جس کی مدد سے انگریزوں کو ہندوستانی زبان کے ساتھ ساتھ یہاں کی معاشرت سے بھی واقف کرایا جانا تھا۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ان کے عہد میں مروّج الفاظ کا بیشتر ذخیرہ ''باغ و بہار'' میں شامل ہو جائے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''باغ و بہار میں دلّی کی تہذیب بول رہی ہے۔ اس کی تصویر گردش کر رہی ہے۔''

''باغ و بہار'' میں ہندوستانی معاشرت کی عام زندگی کی جھلکیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خود میرامن کی زندگی ایک عام آدمی کی طرح گزری۔ انھیں خوبیوں نے باغ و بہار کو سدا بہار بنا دیا۔ دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی ''باغ و بہار'' کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے۔ داستان کیا ہے، گویا مغلیہ عہد کی تہذیب کی عکاس ہے۔ پورے قصہ میں ہندوستان کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اردو کا داستان گو اپنی داستانوں میں عام طور پر عرب ممالک کا ذکر کرتا ہے، کیونکہ اس کے کردار مسلمان ہوتے ہیں۔ اس کے یہاں دمشق، بصرہ، یمن، ایران، مصر، قسطنطنیہ، آذربائیجان کے علاوہ روم اور چین کا بھی ذکر ہوتا ہے، لیکن یہ صرف مکانی فاصلہ پیدا کرنے کے لیے نام لیے جاتے ہیں۔ داستان گو ان داستانوں میں جن کرداروں اور رسم و رواج کو بیان کرتا ہے، وہ خالص ہندوستانی ہوتے ہیں۔ دراصل ہر فنکار کے تخیل کی بنیاد اُس کے مطالعہ اور مشاہدے ہی پر ہوتی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہی اس کے لاشعور میں محفوظ ہوتا ہے، جو خود بخود اس کی تخلیق میں در آتا ہے۔ میرامّن کی زندگی عوام و خواص دونوں کے بیچ گزری۔ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے آشنا تھے، انھوں نے خود کو ''دلّی کا روڑا'' کہا ہے اور روڑے کی وابستگی زمین سے ہوتی ہے۔ زمین سے وابستگی کا مطلب ہے کہ اس کی جڑیں وہاں پیوست ہیں۔ میرامّن کی وابستگی دلّی کی زمین سے تھی۔ وہ عظیم آباد اور کلکتہ میں بھی اپنی زمین سے وابستہ رہے۔ ان کے بیان میں دلّی کے لال قلعہ کا شاہانہ ساز و سامان، شاہزادیوں کے باغات، یہاں کی عالیشان حویلیاں اور چاندنی چوک بھی موجود ہے۔ ''نوطرز مرصّع'' کی طرح ''باغ و بہار'' میں بھی چیزوں اور کھانوں کے نام کی ایک طویل فہرست ہے۔ میرامّن کسی منظر کے بیان کے وقت ہر چیز پر نظر رکھتے ہیں، ان کے بیان میں دلّی کے وزراء اور امراء کی حویلیوں کی آرائش و زیبائش نظر آتی ہے۔

غرض یہ کہ ہر چیز کا بیان میرامّن نے کیا ہے۔ آب دار خانے میں کوری کوری ٹھلیاں گھڑونچیوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ صافیوں اور بجھروں سے انھیں ڈھک رکھا ہے۔ برابر میں چوکی پر کٹورے، ڈونگے، تھالیاں، برف کے آب خورے وغیرہ رکھے ہیں۔ میرامّن کی نظر سے کوئی چیز بچتی نہیں۔ داستان گوئی کی کامیابی ہی اس کی قوت بیان پر ہے۔ جس سے وہ جزئیات نگاری میں کامیاب ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری داستان گوئی کے فن کا ایک حصہ ہے۔ جو قصے کو نہ صرف طول دیتا ہے، بلکہ معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ ''باغ و بہار'' یوں تو ایک مختصر داستان ہے، لیکن اس اختصار میں بھی میرامّن نے جزئیات کے بیان کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک دعوت کا بیان کرتے ہوئے میرامّن لکھتے ہیں:

''اور دسترخوان بچھوا کر، مجھ تن تنہا کے روبہ روبکاول نے ایک تورے کا توراچن دیا۔ چار مشقاب: ایک میں یخنی پلاؤ، دوسری میں قورما پلاؤ اور تیسری میں متنجن، چوتھی میں کوکو پلاؤ اور ایک قاب زردے کی، اور کئی طرح کے قلیے: دو پیازہ، نرگسی، بادامی، روغن جوش اور روٹیاں کئی قسم کی: باقر خانی، تنکی، شیر مال، گاو دیدہ، گاؤ زبان، نانِ نعمت، پراٹھے۔ اور کباب کو فتے کے، تکّے کے، مرغ کے، خاگینہ، ملغوبہ، شبدیگ، دم پخت، حلیم، ہریسا، سموسے ورقی، قبولی، فرنی، شیر برنج، ملائی، حلوا، فالودہ، پن بھتا، نمش، آب شورہ، ساق عروس، لوزیات، مربّا، اچار وان، دہی کی قلفیاں یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔''

''باغ و بہار'' کے مطالعہ سے شاہی تکلّفات اور اس عہد کی تہذیب کا مکمل علم ہوتا ہے۔ کسی تاریخ کی کتاب میں اتنی تفصیل سے ذکر نہیں ملے گا۔ داستان گو اپنی واقفیت کے اظہار اور داستان کو طویل کرنے کی وجہ سے ہر بات کو مفصل بیان کرتا ہے۔ ''باغ و بہار'' کا شمار تو مختصر داستانوں میں ہے، اس کے باوجود یہاں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔ معاشرت کے بیان کی یہی تفصیل ''باغ و بہار'' کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور داستانوں کی طرح ''باغ و بہار'' میں بھی ولادت سے وفات تک کی رسومات کا ذکر مل جاتا ہے۔ بچہ کی ولادت پر خوشیاں منائی جاتی ہیں، مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں، صدقات دیئے جاتے ہیں، زائچے تیار ہوتے ہیں۔ سفر پر جاتے وقت امام ضامن باندھا جاتا ہے۔ ماتھے پر ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ شادی میں سہرا بندھتا ہے۔ انتقال پر تیجہ اور چہلم ہوتا ہے۔ یہ سب ہندوستانی رسمیں ہیں۔ داستان میں ہر جگہ ہندوستان کی تہذیب نظر آتی ہے۔ پہلے درویش کے قصے میں اُس کا بہن کے گھر جا کر رہنے کو داستان گو کا معیوب قرار دینا ہندوستانی تہذیب ہی کا حصہ ہے۔ آج بھی ہندوستانی تہذیب میں شادی شدہ بہن یا بیٹی کے گھر جا کر کھانے پینے کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میر امّن اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ایک دن وہ بہن (جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی: اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے... دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوص اس شہر کے آدمی، چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے: اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔''

یہ بہن بھائی کی محبت، سماجی مجبوری اور ہندوستانی تہذیب کی بہت نمایاں مثال ہے۔ یہاں کے سماج میں بہن یا بیٹی کے گھر جا کر رہنا بے غیرتی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے توہم پرستی بہت زیادہ ہے۔ یہاں دوا سے زیادہ دعا پر یقین کیا جاتا ہے۔ شاہزادے کے علاج کے لیے طبیب حاذق کے علاوہ منجم صادق، ملا سیانے، درویش، مجذوب، نقش تعویذ کے ساتھ ساتھ سادھو سنتوں کو بھی بلاتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' میں جگہ جگہ اس کی مثالیں موجود ہیں، غرض کہ ''باغ و بہار'' میں ابتدا سے آخر تک ہندوستانی معاشرت کے نظارے نظر آتے ہیں۔ اس کے ہر صفحہ پر موجود بیان سے میر امّن کی ہندوستان کی زمین اور تہذیب سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

پہلا درویش یمن کے ملک التجار خواجہ احمد کا بیٹا ہے۔ خواجہ احمد کے انتقال کے بعد باپ کی جمع کی ہوئی دولت سے عیش و عشرت کی زندگی گزارتا ہے۔ دولت کی چاہت میں اُس کے ''غنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹھے، خوشامدی آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے، اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی'' جس کا نتیجہ یہ نکلا

کہ ''اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں، جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے، تاب بھوک کی نہ لا سکا''۔ بالآخر یہ درویش اپنی بہن کے گھر جاتا ہے۔ بہن سماج میں بدنامی کے ڈر سے اُسے کچھ روپے دے کر ایک قافلہ کے ساتھ تجارت کے لیے بھیجتی ہے، لیکن یہ پھر عجیب حالات میں عشق میں پھنس جاتا ہے۔ وہاں بھی ناکامی ہوتی ہے، خودکشی کا ارادہ کرتا ہے کہ ایک نقاب پوش آ کر اُسے روک لیتا ہے اور ملک روم جانے کے لیے کہتا ہے، پہلے درویش کے قصہ پر میر امن نے خاص توجہ دی ہے، اس میں کرداروں کی تعداد بھی زیادہ اور معاشرت کی مثالیں بھی زیادہ ملتی ہیں۔ باغ و بہار کے اسلوب کا بھی اس قصہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں جو بیٹے کی خواہش اور بیٹی کی ناپسندیدگی کا مسئلہ ہے وہ ''باغ و بہار'' میں بھی موجود ہے:

> ''اتفاقاً جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا، وہ لڑکی اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا اور ڈھولک پکھاوج لیے ہوئے رت جگے کی تیاری کر رہی تھی اور کڑھائی چڑھا کر گلگلے اور رُحم تلتی اور بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اس کی ماں روتی پیٹتی، سر کھلے، پانو ننگے، بیٹی کے گھر میں گئی اور دو ہتڑ اس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی، کاش کہ تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا، تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔''

مذکورہ اقتباس میں شادی کے موقع پر ڈھولک بجانے، رت جگے اور گلگلے بنانے کی رسم صرف اور صرف ہندوستانی ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں میں رائج ہے۔ میر امّن ہندو کرداروں کی زبان سے ہندی کے الفاظ ادا کراتے ہیں جس سے صحیح کردار سامنے ابھر کر آتا ہے:

> ''میں کنّیا زیر باد کے دیس کے راجا کی ہوں... ایک روز مہاراج نے آگّیا دی کہ جتنے راجا اور کنور ہیں، میدان میں زیر جھروکے نکل کر تیراندازی اور چوگان بازی کریں تو گھڑ چڑھی اور کسب ہر ایک کا ظاہر ہو، میں رانی کے نیڑے جو میری ماتا تھیں، اٹاری پر اوجھل میں بیٹھی تھی اور دائیاں اور سہیلیاں حاضر تھیں، تماشا دیکھتی تھی۔ یہ دیوان کا پوت سب میں سندر تھا اور گھوڑے کو کاوے دے کر کسب کر رہا تھا، مجھ کو بھایا اور دل سے اس پر ریجھی، مدت تلک یہ بات گپت رکھی۔ آخر جب بہت بیاکل ہوئی، تب دائی سے کہا اور ڈھیر سا انعام دیا۔''

میر امّن نے ہر کردار کے لحاظ سے زبان کا استعمال کیا ہے اور یہ وہی کر سکتا ہے جس کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہو، انھوں نے عوام کے بیچ زندگی گزاری ہے، اسی لیے انھیں مختلف طبقات کے لب و لہجہ سے واقفیت ہے۔ میر امّن اس کو جوں کے توں لکھ دیتے ہیں۔ اپنے بیان کو پُر شکوہ اور پُر تکلف نہیں کرتے۔ ہر جگہ عام زبان اور روزمرہ کا استعمال ہے، یہی چیز ان کی خوبی بن گئی ہے۔ ''باغ و بہار'' میں جگہ جگہ محاورے اور کہاوتیں نظر آتی ہیں۔ بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں، بقول ان کے کہ دلّی کے رہنے والے ہیں اور ان کی زبان ٹھیٹ دلّی کی زبان ہے۔ کچھ اور مثالیں ملاحظہ کیجیے:

> ''جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی، وہیں خیال اُس باغِ نوخرید کا گزرا۔ کمال شوق ہوا کہ ایک دم اس عالم میں وہاں کی سیر کیا چاہیے۔ کم بختی جو آوے، اونٹ چڑھے کتا کاٹے۔ اچھی طرح بیٹھے بٹھائے، ایک دائی کو ساتھ لے کر، سرنگ کی راہ سے اس جوان کے مکان میں گئی۔''

''اے بے وقوف اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات، بس چپ رہ، یہ نکمّی بات چیت مت کر، اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں اُس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی، پر کیا کروں تیری خدمت یاد آتی ہے، اب اس میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے، تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا...... میرے تئیں یے پھساہندے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں، اس اشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو، اس سے جا کر کر۔''

مذکورہ اقتباسات میر امّن کے لب ولہجہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں، ان کا یہی انداز بیان اور یہی زبان پوری داستان میں موجود ہے۔ وہ کہیں مصنوعی اور دقیق یا مبہم نثر نہیں لکھتے، اُن کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہے۔

''باغ وبہار'' کیا ہے، گویا مغلیہ عہد کی تہذیب کی عکاس ہے۔ پورے قصہ میں ہندوستان کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اردو کا داستان گو اپنی داستانوں میں عام طور پر عرب ممالک کا ذکر کرتا ہے، کیونکہ اس کے کردار مسلمان ہوتے ہیں۔ اس کے یہاں دمشق، بصرہ، یمن، ایران، مصر، قسطنطنیہ، آذر بائیجان کے علاوہ روم اور چین کا بھی ذکر ہوتا ہے، لیکن یہ صرف مکانی فاصلہ پیدا کرنے کے لیے نام لیے جاتے ہیں۔ داستان گو ان داستانوں میں جن کرداروں اور رسم ورواج کو بیان کرتا ہے، وہ خالص ہندوستانی ہوتے ہیں۔ دراصل ہر فنکار کے تخیل کی بنیاد اُس کے مطالعہ اور مشاہدے ہی پر ہوتی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہی اس کے لاشعور میں محفوظ ہوتا ہے، جو خود بخود اس کی تخلیق میں در آتا ہے۔ میر امّن کی زندگی عوام وخواص دونوں کے بیچ گزری۔ وہ زندگی کے تمام نشیب وفراز سے آشنا تھے، انھوں نے خود کو ''دلّی کا روڑا'' کہا ہے اور روڑے کی وابستگی زمین سے ہوتی ہے۔ زمین سے وابستگی کا مطلب ہے کہ اس کی جڑیں وہاں پیوست ہیں۔ میر امّن کی وابستگی دلّی کی زمین سے تھی۔ وہ عظیم آباد اور کلکتہ میں بھی اپنی زمین سے وابستہ رہے۔ ان کے بیان میں دلّی کے لال قلعہ کا شاہانہ ساز وسامان، شاہزادیوں کے باغات، یہاں کی عالیشان حویلیاں اور چاندنی چوک بھی موجود ہے۔ ''نوطرز مرصّع'' کی طرح ''باغ وبہار'' میں بھی چیزوں اور کھانوں کے نام کی ایک طویل فہرست ہے۔ میر امّن کسی منظر کے بیان کے وقت ہر چیز پر نظر رکھتے ہیں، ان کے بیان میں دلّی کے وزراء اور امراء کی حویلیوں کی آرائش وزیبائش نظر آتی ہے۔ مثلاً:

''اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے، گلہارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یساول عصا بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا، لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلّف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ پاندان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیرین، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں پر انگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں، رنگ بہ رنگ کی چُنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز اَبرک کی ٹٹّیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔''

جس طرح دسترخوان پر اتنی اقسام کے کھانے دیکھ کر کھانے والے کی روح بھر جاتی ہے۔ اسی طرح پڑھنے والے کی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ یہ تفصیل اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ میر امّن شاہی دسترخوان کے لوازمات سے واقف تھے۔ عام آدمی کھانے کے اتنے ناموں سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ میر امّن کے مشاہدے کا اظہار ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کھانے کے بعد کے تکلّفات کا منظر ملاحظہ کیجیے:

''جب دسترخوان اُٹھا، زیرانداز کا شانی مخمل کا مقیشی بچھا کر، چلمچی، آفتابہ طلائی لاکر، بیسن دان میں خوش بو بیسن دے کر، گرم پانی سے میرے ہاتھ دھلائے۔ پھر پان دان جڑاؤ میں گلوریاں سونے کے پکھروٹوں میں بندھی ہوئیں اور چوگھڑوں میں کھلوریاں اور چکنی سپیاریاں اور لونگ اِلاچیاں، روپے کے ورقوں پر مڑھی ہوئیں، لاکر رکھیں۔''

''باغ و بہار'' میں اپنے عہد سے متعلق معلومات کی جس قدر تفصیل موجود ہے شاید کسی اور مختصر داستان میں ہو۔ اس تفصیل سے فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے، یعنی ہندوستان کی معاشرت کے ساتھ ساتھ یہاں کی اشیاء اور دیگر لوازمات کا علم ہو۔ میر امن مکانوں میں موجود تمام اسباب کے نام تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

''اور جتنا اسباب اس مکان میں تھا شطرنجی، قالینیں، سیتل، پانی، منگل کوٹی، دیوار گیری، چھت، پردے، چلونیں، سائبان، نم گیرے، چھپر کھٹ مع غلاف، ادقچہ، توشک، بالاپوش، سیج بند، چادر، تیکیے، تیکنی، گل تیکیے، مسند، گاؤ تیکیے، دیگ، دیگچے، پتیلے، طباق، رکابی، بادیے، تشتری، چمچے، بکاؤلی، کفگیر، طعام بخش، سرپوش، سینی، خوان پوش، تورہ پوش، آب خورے، بجھرے، صراحی، لگن، پاندان، چوگھرے، چنگیز، گلاب پاش، عود سوز، آفتابہ، چلمچی، سب میرے حوالے کیے کہ یہ تمہارا مال ہے۔''

ان ناموں کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کو ہندوستان کی چیزوں کے نام بتائے جا رہے ہیں۔ کہیں کھانوں کے نام ہیں، کہیں گھر میں استعمال کرنے والی چیزوں کے نام ہیں، کہیں ملازماؤں کے عہدوں کے نام ہیں، کہیں آتش بازی ہے، مثلاً:

''کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے دست بستہ سہیلیاں اور خواجیں اور اُردابیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں، حبشنیاں، اُزبکنیاں، کشمیرنیاں، جواہر میں جڑی، عہدے لیے کھڑی ہیں۔''

''ایک طرف آتش بازی، پھلجھڑی، انار داؤدی، بھچنیا، مروارید، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چھٹتے تھے۔''

ہندوستان میں صدیوں سے توہم پرستی بہت زیادہ ہے۔ یہاں دوا سے زیادہ دعا پر یقین کیا جاتا ہے۔ شاہزادے کے علاج کے لیے طبیب حاذق کے علاوہ منجم صادق، ملا سیانے، درویش، مجذوب، نقش تعویذ کے ساتھ ساتھ سادھو سنتوں کو بھی بلاتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' میں جگہ جگہ اس کی مثالیں موجود ہیں، غرض کہ ''باغ و بہار'' میں ابتدا سے آخر تک ہندوستانی معاشرت کے نظارے نظر آتے ہیں۔ اس کے ہر صفحہ پر موجود بیان سے میر امّن کی ہندوستان کی زمین اور تہذیب سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

داستان کی جمالیات میں اسلوب اور معاشرت کے علاوہ مناظر فطرت کا بیان بھی حسن بخشتا ہے۔ ''باغ و بہار'' میں مفصل نہیں مختصراً مختلف مقامات پر باغات کا ذکر کیا ہے:

''وہیں اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا، جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا، وہ بڑی بہار کا باغ تھا، حوض اور نہروں میں فوّارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے، ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا، رنگ بہ رنگ کے جانور اُن پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے۔''

''وہاں سے باغ کی طرف چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اُس باغ کی بہار، بہشت کی برابری کر رہی تھی۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سرسبز پتوں پر جو پڑے ہیں، گویا زمرّد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں۔ اور سرخی پھولوں کی اُس ابر میں ایسی بھلی لگتی ہے، جیسے شام کو شفق پھولی ہے۔ اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔''

ہندوستان کا بڑا حصہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کا کوئی طاقتور مخالف نہیں بچا تھا۔ مغلیہ سلطنت آخری سانسیں لے رہی تھی، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے حالات میں بہت سے راجا اور نوابوں کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب اور شاعر بھی انگریزوں کے روبرو قصیدہ خوانی کے لیے دست بستہ کھڑے ہوئے، یعنی مغلیہ سلطنت کے خاندانی نمک خوار ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے لگے۔ میر امّن جن کی کئی پشتیں مغلیہ سلطنت کی ملازمت میں رہیں ایسے وقت میں بادشاہ وقت کو نظر انداز کر کے لارڈ ویلزلی کی تعریف میں الفاظ کا دریا بہا دیتے ہیں۔ اور اس دلّی کو بھی بھول کر جسے دنیا کا خوبصورت ترین شہر کہا جاتا تھا ملک فرنگ کی تعریف میں لگ جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت بھی ہے اور حالات کے بہاؤ میں اپنی شناخت کھو دینا بھی ہے۔ تیسرے درویش کی سیر میں لکھتے ہیں:

''ایک بار یہ خیال جی میں آیا کہ چاروں دانگ ملک تو پھرا، لیکن جزیرہ فرنگ کی طرف نہ گیا اور وہاں کے بادشاہ کو اور رعیت و سپاہ کو نہ دیکھا...... ایک قافلہ سوداگروں کا اکٹھا کر کر، جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ ہوا جو موافق پائی، کئی مہینوں میں اُس ملک میں جا داخل ہوا۔ شہر میں ڈیرا کیا۔ عجب شہر دیکھا کہ کوئی شہر اس شہر کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ ہر ایک بازار و کوچے میں پختہ سڑکیں بنی ہوئیں اور چھڑکاؤ کیا ہوا۔ صفائی ایسی کہ ایک تنکا کہیں پڑا نظر نہ آیا۔ کوڑے کا تو کیا ذکر ہے۔ اور عمارتیں رنگ بہ رنگ کی اور رات کو رستوں میں قدم بہ قدم روشنی۔ اور شہر کے باہر باغات کہ جن میں عجائب گل بوٹے اور میوے نظر آئے کہ شاید سوائے بہشت کے کہیں اور نہ ہوں گے۔ جو وہاں کی تعریف کروں، سو بجا ہے۔''

میر امّن انگریزوں کی خوشامد میں اُس دلّی کو فراموش کر گئے جس کے بارے میں میؔر نے کہا ہے

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

لیکن شہر فرنگ کے بیان میں بھی دلّی نظر آتی ہے، کیونکہ میر امّن نے شہر فرنگ نہیں دیکھا تھا۔

بہر کیف ''باغ و بہار'' اور اردو نثر کے ارتقا کے حوالے سے میر امّن کی شخصیت قابل ذکر نظر آتی ہے۔ بلاشبہ ''باغ و بہار'' کو اردو کی ایک اہم داستان اور میر امّن کو اردو کی جدید نثر کا مسیحا کہا جا سکتا ہے۔

باغ و بہار اگرچہ کلکتہ میں بیٹھ کر لکھی گئی، لیکن میر امن کے لاشعور میں دہلی کی تہذیب محفوظ تھی، وہی ''باغ و بہار'' میں نظر آتی ہے:

''تمام حویلی میں فرش مکلّف لایق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے۔ مسندیں لگی ہیں، پاندان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں میں رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں

رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے،ایک طرف جھاڑ اور سروکنول کے روشن ہیں۔سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد ہیں،باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔آب دار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھیں اور بجروں سے ڈھکی ہیں۔آگے چوکی پر ڈونگے،کٹورے بہ مع تھالی سرپوش دھرے،برف کے آب خورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں اور کنچنیاں،بھانڈ،بھگتیے،کلاونت،قوّال اچھی پوشاک پہنے ساز کے سُر ملاتے حاضر ہیں۔''

داستانیں ایسی معلومات کا سمندر ہیں جن میں تہذیب کے جواہر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔داستان گو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ داستان کے واقعات میں ان تہذیبی مرقعوں کو شامل کرتا ہے۔ہندوستان کی شادی رسموں کا دوسرا نام ہے۔شادی کے موقع پر جس قدر رسمیں ہندوستانی تہذیب میں شامل ہیں شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ہوں۔ہندوستان کے مسلمان اور ہندوؤں کی رسومات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔سوائے آگ کے گرد چکّر لگانے کے سب رسمیں ہندوانہ ہیں۔یہاں نسبت کی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔شادی سے پہلے مایوں بٹھایا جاتا ہے۔ساچق،بارات،عقد،آرسی مصحف،جہیز و رخصت،چوتھی،ولیمہ،سمدھنوں کے گانے وغیرہ رسم و رواج کے لازمی اجزا ہیں۔داستانوں سے ان کے علاوہ ملبوسات،زیورات و جواہرات،اشیائے خورد و نوش،تجہیز و تکفین کے طریقے وغیرہ کا بھی علم ہوتا ہے۔کھانوں کے جتنے اقسام داستانوں میں بتائے گئے ہیں شاید ہی کسی تاریخ کی کتاب میں ملیں:

> ''داروغۂ مطبخ نے عرض کی کہ خاصہ تیار ہے،ملکہ نے کہا بسم اللہ دسترخوان بچھاؤ۔کنیزوں نے طرفۃ العین میں طعامہائے رنگا رنگ،میوہ ہائے گوناگوں سے صحن دسترخوان مثل چمن پُر بہار آراستہ کرایا۔یخنی پلاؤ،قورمہ پلاؤ،زیر بریاں،متنجن،میٹھے چاول،مزعفر،قلیہ،کباب،مرغ،کوفتے،پسندے،میانہ پر،باقر خانیاں،شیر مالیں آبی،تنکی،خمیری،فرنی،یاقوتی،دلیا،دسمیا،رائتا،اچار،مربّے،ساری دنیا کے میوے چنے گئے۔فریدون جمیل نے ایک قاب میں سے قدرے کھانا کھایا۔''

داستانوں کے ذریعہ ہمیں اس عہد کی تفریح کے ذرائع بھی معلوم ہوتے ہیں۔مغلوں کے زمانے میں آئے دن کسی نہ کسی بہانے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا،جگہ جگہ میلے ٹھیلے لگتے تھے،تیوہار منائے جاتے تھے۔اس عہد میں گیندہ بازی،شطرنج،قصہ گوئی،نقالی،چوگان بازی وغیرہ عام تھی۔یہی چیزیں دل بہلانے کا ذریعہ تھی۔شادیوں کے جلوس اور اس سے متعلق رسموں کا تفصیلی ذکر داستانوں میں موجود ہے۔داستانیں اس لیے اہم ہیں کہ ان میں وہ تہذیب محفوظ ہے جو اب تاریخ بن چکی ہے۔یعنی شاہی تہذیب،داستانوں کی کہانیاں،بادشاہوں،شاہزادوں اور شاہزادیوں کی کہانیاں ہیں،اس لیے ان میں تخت نشینی کے جشن،دربار کی رونقیں،آداب دربار،شاہی سواریوں کی شان،بادشاہوں کے شب و روز،حرم سرا کی رنگینیاں،غرضیکہ سب کچھ موجود ہے۔داستانوں میں اگرچہ فرضی قصے بیان کیے جاتے ہیں،لیکن داستان گو کا تخیل اور جمال پرست فطرت تہذیب کے رنگ بھر دیتی ہے۔داستانوں میں موجود معاشرت ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔

شاہزادیوں کے باغات کے بیان میں داستان گو جنت کی جھلک دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔داستان کے سامعین خود کو اسی ماحول میں محسوس کر کے فرحت حاصل کرتے ہیں۔داستانوں میں موجود قدرتی مناظر جمالیاتی انبساط کا

ذریعہ ہیں۔ داستان امیر حمزہ ہو یا بوستان خیال یا دیگر داستانیں، قدرتی نظارے ہر داستان میں نظر آتے ہیں۔ یہی داستان کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' کے پہلے درویش کے قصہ میں ایک باغ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''اس باغ کی بہار، بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سبز سبز پتّوں پر جو پڑے ہیں، گویا زمرّد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں۔ اور سرخی پھولوں کی اس ابر میں ایسی بھلی لگتی ہے، جیسے شام کو شفق پھولی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔''

آگے ایک اور خوبصورت بیان کیا گیا ہے:

''اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا، بعینہٖ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آجاتا ہے۔ بڑی کیفیت ہوئی چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا: اب چل کر باغ کے بالاخانے پر بیٹھیے۔''

داستانوں میں کہیں باغات کا بیان ہے، کہیں جنگلات کا کہیں صحرائے لق ودق کا کہیں پرستان کا، کہیں شہروں کی آرائش کا۔ داستان گو کا مقصد جمال پرستی کا اظہار کر کے مرعوب کرنا ہے۔ اس کی توجہ خوب سے خوب تر پر ہوتی ہے۔ وہ سابقہ داستانوں کے مقابلہ میں بیان اور معلومات کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ داستانوں میں باغات کی طرح شہروں کے حسن کا بھی ذکر ہے۔

داستانوں میں کہانیاں بادشاہوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کی ہوتی ہیں، اس لیے ان کرداروں سے وابستہ ہر شئے حسین دکھائی جاتی ہے، خواہ وہ ہتھیار ہوں، سواریاں ہوں یا چرند پرند۔ طویل داستانوں میں رزم کے بیان کی وجہ سے ہتھیاروں اور ہاتھی گھوڑوں کا بار بار ذکر آتا ہے، البتہ مختصر داستانوں میں توتے اور ہرن باقاعدہ انسانوں کی طرح کردار ادا کرتے ہیں۔ الف لیلہ کے تو بہت سے قصّوں کے کردار جانور ہی ہیں جو انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ ''فسانۂ عجائب'' کا توتا داستان کے آغاز کی وجہ بنتا ہے۔ ''باغ و بہار'' میں خواجہ سگ پرست کا کتا اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، جس کے پٹے میں بارہ عدد لعل بے بہا ٹنکے ہوئے ہیں:

''دوسری طرف جو دیکھا تو ایک دوکان میں قالیچے بچھے ہیں، اُن پر ایک چوکی ہاتھی دانت کی، اس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہوا، ایک کتّا جواہر کا پٹّا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے اور دو غلام امرد، خوب صورت اور اس کی خدمت کر رہے ہیں، ایک تو مورچھل دستے کا لیے جھلتا ہے اور دوسرا رومال تارکشی کا ہاتھ میں لے کر منہ اور پاؤں اس کا پونچھ رہا ہے۔''

کائنات میں بہت سی چیزیں قدرتی طور پر حسین ہوتی ہیں، جیسے درخت، پہاڑ، چاند، تارے، چرند پرند۔ ان کے جمال سے انسان حظ حاصل کرتا ہے۔ کچھ جاندار اور بے جان چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو انسان اپنے جمالیاتی ذوق کے مطابق خوبصورت بنا دیتا ہے۔ وہ پتھروں سے خوبصورت محل تعمیر کرتا ہے۔ لکڑی کو تراش کر مختلف اشیاء تیار کر لیتا ہے۔ دیواروں پر انسانوں اور جانوروں کی تصویریں بناتا ہے۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- داستانوں میں معاشرت کی عکاسی سے واقف ہوئے۔
- باغ و بہار میں ہندوستانی معاشرت کی عکاسی سے واقف ہوئے۔
- باغ و بہار میں مناظر فطرت کے بیان کا جائزہ لیا۔
- میر امن کی جزئیات نگاری کا مطالعہ کیا۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. باغ و بہار کب اور کہاں لکھی گئی؟
2. میر امن کہاں کے رہنے والے تھے؟
3. باغ و بہار میں کتنے درویشوں کے قصے ہیں؟
4. اردو کی چار اہم اور مشہور داستانوں کے نام بتائیے؟
5. پہلا درویش دولت ختم ہونے کے بعد کس کے گھر گیا؟
6. باغ و بہار میں دلی کی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے، مثال کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

11.6 سوالوں کے جوابات

1 'باغ و بہار' 1803ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں لکھی گئی۔

2. میر امن دہلی کے رہنے والے تھے۔

3. داستان 'باغ و بہار' میں چار درویشوں کیقصے بیان ہوئے ہیں۔

4. اردو کی چار اہم اور مشہور داستانیں 'داستان امیر حمزہ'، بوستان خیال، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب ہیں

5. پہلا درویش دولت ختم ہونے کے بعد مشکل دنگزارنے کی غرض سے اپنی بہن کے گھر گیا۔

6. باغ و بہار اگر چہ کلکتہ میں بیٹھ کر لکھی گئی، لیکن میر امن کے لاشعور میں دہلی کی تہذیب محفوظ تھی، وہی ''باغ و بہار'' میں نظر آتی ہے یہ منظر ملاحظہ ہو:

''تمام حویلی میں فرش مکلّف لائق ہر مکان کے جابجا بچھا ہے۔ اور مسندیں لگی ہیں، پاندان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں میں رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے، ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں۔ سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد ہیں، باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ آب دار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھیں اور بجروں

سے ڈھکی ہیں۔آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے بہ مع تھالی سر پوش دھرے، برف کے آب خورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلاونت، قوّال اچھی پوشاک پہنے ساز کے سُر ملاتے حاضر ہیں۔''

11.7 فرہنگ

جزئیات	تفصیل، جزو کی جمع
جمالیات	خوبصورتی
قوت متخیلہ	خیال یا تخیل کی طاقت
مشاہدہ	دیکھنا
متروک	چھوڑا ہوا
طبیب حاذق	حکیم
منجم صادق	نجومی
لاشعور	جہاں عقل نہ پہنچ سکے

11.8 کتب برائے مطالعہ

اردو کی نثری داستانیں	گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۷ء
اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	ادارۂ فروغِ اردو، امین آباد، لکھنو
ہماری داستانیں	وقار عظیم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان، نئی دہلی
داستان سے ناول تک	ابن کنول	ایس این لینگویج اکیڈمی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۰۰۳ء
میر امن (مونوگراف)	ابن کنول	اردو اکادمی دہلی ۲۰۱۲ء
داستان کی جمالیات (اردو کی نثری داستانیں)	ابن کنول	M.R. Publications New Delhi 2020
اردو داستان (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر سہیل بخاری	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء
باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ	امام مرتضی نقوی	اردو پبلشرز تلک مارگ لکھنو ۱۹۷۸ء
فرہنگِ باغ و بہار	ساجدہ قریشی	اسلامک ونڈرس بیرونئی دہلی ۲۰۱۵ء
باغ و بہار (مرتبہ)	ابن کنول	